عثمان برادرز، لاہور برائے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

مرقعِ ادب

(ترتیبِ نو)

گیارھویں بارھویں جماعتوں کے لیے

فرمانِ قائدِ اعظم

آپ کی توجہ صرف حصولِ علم کے لیے وقف رہے، صرف اسی صورت میں آپ اپنے ملک کو دنیا کا عظیم، طاقت ور اور ترقی یافتہ ملک بنا کر سرخروئی حاصل کر سکتے ہیں۔

(نوجوانوں سے خطاب)

عثمان برادرز لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور

تعدادِ اشاعت	تاریخِ اشاعت	طباعت	ایڈیشن
15,000+43,000=58,000	جولائی 1992	14	دوم

مُرقّعِ ادب ۱۱—۱۲

(ترتیبِ نو)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لیے

عثمان برادرز، لاہور

برائے

پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

ایڈیشن	طباعت	تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت
دوم	14	جولائی 1992	15,000+43,000=58,000

تیار کردہ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور

منظور شدہ قومی ریویو کمیٹی وفاق وزارتِ تعلیم ، حکومتِ پاکستان

مرتبین :

پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا

پروفیسر عمر محمد خان فیضی

پروفیسر الطاف فاطمہ

نگرانِ ادارت و طباعت :

نصیر احمد بھٹی

ناشر : عثمان برادرز ، لاہور

مطبع : زاہد بشیر پرنٹرز ، لاہور

پیش لفظ

انٹرمیڈیٹ کلاسوں کے لیے اردو لازمی کی یہ کتاب وفاق وزارتِ تعلیمات حکومت پاکستان کی مقررہ نصاب کمیٹی کی سفارشات کے مطابق مرتب کی گئی ہے۔ مذکورہ نصاب کمیٹی نے انٹرمیڈیٹ (اردو لازمی) کے لیے نصاب کا نیا خاکہ مرتب کیا ہے۔ اگرچہ یہ کتاب نصاب کمیٹی کے اجلاس سے پہلے مرتب ہو چکی تھی مگر نئے خاکے کے مطابق مناسب ترامیم کر کے پوری کتاب از سرِ نو مرتب کی گئی اور سفارشات کی روشنی میں ضخامت کم کرنے کے علاوہ شعراء و ادباء کے بارے میں تعارفی نوٹ بھی خارج کر دیے گئے۔

چونکہ اردو لازمی کی تدریس اردو اعلیٰ کی تدریس سے مختلف ہونا قرار پائی ہے اس لیے کوشش کی گئی ہے کہ کتاب سائنس، آرٹس اور کامرس کے طلبہ کے لیے یکساں طور پر مفید ہو۔ یہی وجہ ہے کہ داستانوی ادب اور میر و درد سے قبل کے دور کی شاعری اس میں شامل نہیں کی گئی اور قریب العہد ادب کا زیادہ سے زیادہ انتخاب شامل کیا گیا ہے۔

کتاب کو مرتب کرتے ہوئے مندرجہ ذیل امور کو بالخصوص ملحوظ رکھا گیا ہے:

(ا) منتخب کردہ ادب پارے مروجہ زبان کے قریب ہوں اور طلبہ کی اپنی تحریروں کے لیے نمونے کا کام دے سکیں۔ نثر کے انتخاب میں اس اصول کو بالخصوص مدنظر رکھا گیا ہے۔

(ب) کتاب پاکستان کے اسلامی تشخص کو ابھارے۔ اسلام ایک زندہ مذہب کے طور پر سامنے آئے اور طلبہ کو احساس ہو کہ

اسلام ، ماضی ، حال اور مستقبل کے تقاضوں کا بخوبی ساتھ دے سکتا ہے۔

(ج) کتاب تحریک پاکستان کے پس منظر ، تخلیق پاکستان کے محرکات ، پاکستان کے جغرافیے اور ثقافت کو واضح کرے ۔

(د) اسباق ہماری معاشرت سے مربوط ہوں اور طلبہ کو یہ احساس ہو کہ جو کچھ ان کے زیر مطالعہ ہے اس کا معاشرے سے تعلق موجود ہے۔

(ہ) منظوم و منثور ادبی نمونے تخیل کو مہمیز کرنے کے ساتھ ساتھ توہمات اور مجرد کیفیات کی بجائے مشاہدات اور ٹھوس واقعات و کردار پیش کریں ۔

(و) کتاب کے مطالعے سے حصولِ علم کی لگن اور محنت کا جذبہ پیدا ہو۔

امید ہے کہ اساتذہ اور طلبہ کتاب کو ان مقاصد سے ہم آہنگ پائیں گے ۔

مرتبین

فہرست مضامین

حصۂ نثر

قصہ، کہانی، ڈراما

مکاتیب

مضامین و مقالات

شخصی خاکے

سفر نامہ

طنز و مزاح

سائنسی مضامین

نظمیں

غزلیات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نذیر احمد

(۱۸۳۶ء تا ۱۹۱۲ء)

ماما عظمت

اصغری ایک ہنر مند اور با سلیقہ لڑکی تھی۔ اس کی شادی محمد کامل سے ہوئی۔ وہ سسرال میں آئی تو وہاں بھی طبیعت کے اعتدال اور سلیقہ شعاری سے سب کو متاثر کیا۔ اس نے اپنی نند محمودہ سے ربط بڑھایا اور اس کے ذریعے گھر کے معاملات سے باخبر رہنے لگی۔ چند دنوں میں باورچی خانے تک جانے لگی اور ماما عظمت کو بھوننے بگھارنے میں صلاح دینے لگی۔ جلد ہی اسے معلوم ہوگیا کہ ماما عظمت اس گھر کے ہر کام میں دخیل ہے اور سخت بد دیانت ہے۔

اس ماما عظمت کی حقیقت اس طرح پر ہے کہ یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی اور ہمیشہ لوٹنے پر اتارو۔ ایک دن کی بات ہو تو چھپ چھپا جائے۔ آئے دن اس پر شبہہ ہوتا رہتا تھا مگر تھی چالاک۔ گرفت میں نہیں آتی تھی۔ کئی مرتبہ نکالی گئی، جب موقوف ہوئی بنیے، بزاز، سنار، قصائی، کنجڑے جن سے ان کی معرفت اچاپت قرض اٹھتی تھی، تقاضے کو آ موجود ہوے۔ اس ڈر کے مارے پھر بلائی جاتی تھی۔ یوں چوری اور سر زوری ماما عظمت کی تقدیر میں لکھی تھی۔ جتا کر لیتی اور بتا کر چراتی، دکھا کر نکالتی اور لکھا کر مکر جاتی۔ گھر میں آمدنی کم اور عادتیں بگڑی ہوئیں۔ کھانے میں امتیاز، کپڑے میں تکلّف، سب

کارخانہ قرض پر تھا اور قرض کی آڑھت ماما عظمت کے دم سے تھی - کھلے خزانے کہتی تھی کہ میرا نکلنا آسان بات نہیں - گھر نیلام کرا کے نکلوں گی - اینٹ سے اینٹ بجا کر جاؤں گی - اصغری نے جو حساب کتاب میں روک ٹوک شروع کی تو ماما عظمت اصغری کی جانی دشمن ہوگئی اور اپنے بچاؤ کے لیے بدلہ لینے کی نظر سے تدبیریں سوچنے لگی اور اس فکر میں ہوئی کہ محمد کامل اور اس کی ماں سے اصغری کو برا بنائے - اصغری نے جب دیکھا کہ ماما گھر کی مختار کل ہے تو اپنے جی میں کہا --- "پھر ناحق کی جھک جھک سے کیا فائدہ ؟" باورچی خانے کا جانا اور کھانے میں دخل دینا بالکل موقوف کیا - گھر والوں کو اصغری کے ہاتھ کی چاٹ لگ گئی تھی - پہلے ہی وقت سے منہ بنانے لگے -

ایک دن برسات کے موسم میں بادل گھرا ہوا تھا - ننھی ننھی پھوار پڑ رہی تھی - ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی - محمد کامل نے کہا :"آج تو کڑاہی کو دل چاہتا ہے لیکن بشرطیکہ تمیز دار بہو اہتمام کریں"- اصغری کوٹھے پر رہا کرتی تھی ، اس کو خبر نہیں کہ محمد کامل نے کڑاہی کی فرمائش کی - ماما عظمت گھی ، شکر ، بیسن وغیرہ لے آئی اور محمد کامل سے کہا :"صاحبزادے لیجیے سب سودا تو میں لے آئی - جاؤں بہو صاحب کو بلا لاؤں"-

کوٹھے پر گئی تو اصغری سے کڑاہی کا کچھ تذکرہ تک نہیں آیا - اسی طرح الٹے پاؤں اتر آئی اور کہا :"بہو کہتی ہیں میرے سر میں درد ہے"- ماما عظمت سے معمولی کھانا تو پک نہیں سکتا تھا کڑاہی کیا خاک تلتی - سب چیزوں کا ستیاناس ملا کر رکھ دیا - کس چاؤ سے تو محمد کامل نے فرمائش کی تھی ، بد مزہ پکوان کھا کر بہت اداس ہوا - کوٹھے پر گیا تو بی بی کو دیکھا بیٹھی ہوئی اپنا پائجامہ سی رہی ہیں - جی ہی جی میں ناخوش ہوا کہ ایں ! سینے کو

سر میں درد نہیں اور ذرا کڑاہی کو کہا تو درد سر کا بہانہ کر دیا ۔ یہ پہلی ناخوشی محمد کامل کو اصغری سے پیدا ہوئی اور دستور ہے کہ میاں بیبیوں میں بگاڑ اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں پیدا ہوتا ہے ۔ اگر محمد کامل بی بی سے بطور شکایت پوچھتا کہ کیوں صاحب ذرا سا کام نہ ہو سکا تم سے ، اور درد سر کا بہانہ کر دیا ، اسی وقت دو چار باتوں میں معاملہ طے ہو جاتا اور ماما عظمت کی فطرت کھل پڑتی لیکن محمد کامل نے منہ پر تو لگائی مہر اور دل میں دفتر شکایت لکھ چلا ۔ اصغری کو محمد کامل کی کم التفاتی سے کھٹکا ہوا اور سمجھی کہ خدا خیر کرے ۔ لڑائی کا آغاز نظر آتا ہے ، ساس کو دیکھا تو ان کو بھی کسی قدر مکدّر پایا ۔ حیرت میں تھی کہ الٰہی کیا ماجرا ہے ؟

ابھی یہ بات طے نہیں ہوئی تھی کہ ماما عظمت نے ایک شرارت اور کی ۔ رمضان کا قرب تھا ۔ محمد کامل کی ماں نے ماما عظمت سے کہا :"ماما ! رمضان آتا ہے ۔ ابھی سے سب تیاری کر چلو ۔ برتن چھوٹے بڑے سب قلعی کروانے ہیں ۔ مکان میں برس بھر ہوا سفیدی نہیں ہوئی ۔ لالہ ہزاری مل سے کہو کہ جس طرح ہو سکے کہیں سے پچاس روپے دے ۔ عید کا خرچ سر پر چلا آتا ہے ۔"

ماما عظمت بولی :"تمیز دار بہو اپنی ماں کے یہاں مہمان جائیں گی ۔ بہو جائیں گی تو چھوٹے صاحبزادے بھی جائیں گے ۔ پھر بیوی تمہارا اکیلا دم ہے ۔ مکان میں قلعی ہو کر کیا ہوگی اور برتن قلعی ہو کر کیا ہوں گے ۔ ہزاری مل کم بخت تو ایسا بے مروت ہو گیا ہے کہ ہر روز تقاضے کو اس کا آدمی دروازے پر کھڑا رہتا ہے اور قرض کیوں کر دے گا ۔"

محمد کامل کی ماں نے ماما سے پوچھا :"سچ بتا ۔ تمیز دار بہو ضرور جائیں گی ؟" ماما بولی :" بیوی جانے نہ جانے کی تو خدا جانے ، جو

سنا تھا سو کہہ دیا۔"

ماما عظمت کی شامت سر پر سوار تھی۔ تیسرا وار اصغری پر اور صحیح کیا۔

ہزاری مل کی تو عادت تھی جب کبھی ماما عظمت کو اپنی دکان کے سامنے سے آتے جاتے دیکھتا تو ادبدا کر چھیڑتا کہ کیوں ماما ہمارے حساب کتاب کا بھی کچھ فکر ہے؟ اور ساتویں آٹھویں دن گھر پر تقاضا کہلا بھیجتا۔ ایک دن حسب معمول ماما عظمت سودے سلف کو باہر جاتی تھی۔ ہزاری مل نے ٹوکا۔ ماما بولی:
"اے لالہ! یہ کیا تم نے مجھ سے آئے دن کی چھیڑ خانی مقرر کی ہے، جب مجھ کو دیکھتے ہو تقاضا کرتے ہو جن کو دیتے ہو ان سے مانگو، ان سے تقاضا کرو۔"

ہزاری مل نے کہا: "یہ بات تم نے کیا کہی کہ مجھ سے واسطہ نہیں۔ دکان سے تو تم ہی لے جاتی ہو، ہاتھ کو ہاتھ پہچانتا ہے۔ ہم تو تم کو جانتے ہیں اور تمہاری ساکھ پر دیتے ہیں ہم گھر والوں کو کیا جانیں؟ بیوہار تو مالک کے ہاتھ ہے۔ پر تمہارے ہاتھوں سے ہوتا ہے یا نہیں۔ نہ ہمارے نام رقعہ نہ چٹھی۔ تم نے مالک کے نام پر جو مانگا سو دیا۔"

ماما: "ہاں یوں کہو، اس سے میں کب مکرتی ہوں۔ جو لے گئی ہوں ہزاروں میں کہہ دوں، لاکھوں میں کہہ دوں اور ہماری بیوی بھی بے چاری کبھی تکرار نہیں کرتیں۔"

ہزاری مل: ماما! بیگم صاحب تو حقیقت میں بڑی مہر ہیں۔ واہ کیا بات ہے۔ پھر ہزاری مل نے آہستہ سے پوچھا۔ چھوٹی بہو صاحب کا کیا حال ہے؟ کیسی ہیں؟"

ماما: "لالہ! کچھ نہ پوچھو، بیٹی تو امیر گھر کی ہیں پر دل کی بڑی تنگ ہیں۔"

بہت سی باتوں کے بعد ماما عظمت ہزاری مل سے رخصت ہو کر سودا سلف لے کر گھر میں آئی تو محمد کامل کی ماں نے پوچھا : "ماما ! تو بازار جاتی ہے تو ایسی بے فکر ہو جاتی ہے کہ کھانا پکانے کا کچھ خیال تجھ کو نہیں رہتا ۔ دیکھ تو کتنا دن چڑھا ہے ۔ اب کس وقت گوشت چڑھے گا ۔ کب پکے گا ؟ کھانا کب ملے گا ؟"

ماما ! "موے ہزاری مل کے جھگڑے میں اتنی دیر ہوگئی ۔ وہ جانہار ہر روز مجھ کو آتے جاتے ٹوکا کرتا ہے ۔ آج میری جان جل گئی اور میں نے کہا : کیا تو نے مجھ سے روز کی چھیڑ خانی مقرر کی ہے ۔ کیوں مرا جاتا ہے ؟ ذرا صبر کر ۔ خرچ آنے دے تو تیرا اگلا پچھلا حساب کتاب بیباق ہو جائے گا ۔ وہ موا تو میرے سر ہوگیا اور بھرے بازار میں لگا مجھ کو فضیحت کرنے ۔"

محمد کامل کی ماں : "ہزاری مل کو کیا ہوگیا ہے ؟ وہ تو ایسا نہ تھا ۔ آخر برسوں سے ہمارا اس کا لین دین ہے ۔ سویرے بھی دیا ہے ۔ دیر کر کے بھی دیا ہے ۔ کبھی اس نے تکرار نہیں کی ۔"

ماما : "بیوی کوئی اور مہاجن دکان میں ساجھی ہوا ہے ۔ اس موے نے جلدی مچا رکھی ہے ۔ جس جس پر لینا تھا سب سے کھڑے کھڑے وصول کر لیا ۔ جس نے نہیں دیا نالش کر دی ۔

اس خبر کے سنتے ہی محمد کامل کی ماں کو سخت تردُّد پیدا ہوا ۔ اس نے ماما عظمت سے کہا : "اگر سچ مچ ہزاری مل نے نالش کر دی تو کیا ہوگا ؟ میرے پاس تو اتنا اثاثہ بھی نہیں کہ بیچ کر ادا کر دوں گی ۔"

ماما : "بیوی نالش تو ہوئی دھری ہے ۔ مہینے بھر کے واسطے تمیز دار ہو اپنے کڑے دے دیتیں تو بات رہ جاتی ۔ بالفعل ان کڑوں کو گروی رکھ آدھے تہائی ہزاری مل کے بھگت جاتے ۔ مہینے بھر

میں یا تو میاں[1] خرچ بھیج دیتے یا میں کسی اور مہاجن سے لے آتی۔"

محمد کامل کی ماں : "اری تو کوئی دیوانی ہوئی ہے - خبردار ایسی بات منہ سے بھی مت نکالنا - اگر رہنے کا مکان تک بھی بک جائے تو بلا سے مجھ کو منظور ہے لیکن بھو سے کہنے کا منہ نہیں - ڈولی لے آؤ - میں بہن تک جاؤں - پھر جیسی صلاح ٹھہرے گی - دیکھا جائے گا۔"

محمد کامل کی ماں تو سوار ہو بہن کے ہاں خانم کے بازار سدھاریں اور محمودہ[2] نے سب حال تمیز دار بھو کو جا سنایا - وہاں محمد کامل کی ماں کو ان کی بہن نے ٹھہرا لیا -

ماما عظمت نے بیٹھے بٹھائے ایک بد ذوقی اور کی - ان دنوں لاٹ صاحب کی آمد آمد تھی - شہر کی صفائی کے واسطے حاکم کی طرف سے بہت تاکید ہوئی - ہر محلے اور ہر کوچے میں اشتہار لگائے گئے کہ سب لوگ اپنے اپنے کوچے اور گلیاں صاف کریں - دروازوں پر سفیدی کرا لیں ، بدرویں صاف رکھیں - اگر کسی جگہ کوڑا پڑا ملے گا تو جرمانہ کیا جائے گا - اسی مضمون کا ایک اشتہار اس محلے کے پھاٹک پر بھی لگایا گیا - ماما عظمت جا کر محلے کے پھاٹک سے وہ اشتہار اکھاڑ لائی اور چپکے سے اپنے دروازے پر لگا دیا - پھر اندھیرے منہ خانم کے بازار میں محمد کامل کی ماں سے خبر کرنے دوڑی گئی - ابھی مکان کے کواڑ بھی نہیں کھلے تھے کہ اس نے جا آواز دی - محمد کامل کی ماں نے آواز پہچانی اور کہا : "ارے دوڑو ! کواڑ کھولو - عظمت ایسے ناوقت کیوں بھاگی آئی ہے ؟"

عظمت سامنے آئی تو پوچھا : "ماما خیریت ہے ؟"

عظمت بولی - "بیوی مکان پر اشتہار و شتار کیا ہوتا ہے (اے ہے مجھ رنڈیا کو تو سیدھا نام بھی نہیں آتا) لگا ہوا ہے - معلوم

---

۱ - مراد محمد کامل کے والد سے ہے جو لاہور میں ملازم بتائے گئے ہیں -

۲ - محمد کامل کی چھوٹی بہن اور اصغری کی نند -

ہوتا ہے کہ ہزاری مل نے نالش کر دی ۔"

محمد کامل کی ماں نے اپنی بہن سے کہا ۔ "لو بوا ! میں تو جاتی ہوں ۔ جاؤں ہزاری مل کو بلوا کر سمجھاؤں گی ۔ خدا اس کے دل میں رحم ڈالے ۔"

بہن بولی ۔ "آپا میں شرمندہ ہوں کہ مجھ سے روپے کا بندوبست نہ ہو سکا لیکن میرے گلے کا توڑا موجود ہے ۔ اس کو لیتی جاؤ گروی رکھنے سے کام نکلے تو خیر ورنہ بیچ ڈالنا ۔"

محمد کامل کی ماں نے کہا "خیر میں توڑا لیے جاتی ہوں ۔ مگر اس کا روپیہ بہت چڑھ گیا ہے ۔ ایک توڑے سے کیا ہوگا ؟۔

بہن بولی ۔ "آخر انھوں نے بھی تو کہا ہے کہ میں کسی دوسرے مہاجن سے قرض لا دوں گا ۔ تم بسم اللہ کر کے سوار ہو ۔ وہ آتے ہیں تو میں ان کو بھی پیچھے سے بھیجتی ہوں ۔"

غرض محمد کامل کی ماں مکان پر پہنچی ۔ دروازے پر اتری ۔ اشتہار لگا دیکھا افسوس کی حالت میں چپ آ کر بیٹھ گئیں ۔ ساس کی آمد سن کر اصغری کوٹھے پر سے اتری ۔ سلام کیا ۔ ساس کو مغموم دیکھ کر پوچھا ۔ "آج اماں جان آپ کا چہرہ بہت اداس ہے ۔"

ساس ۔ "مہاجن نے نالش کر دی ہے ۔ روپے کی صورت کہیں سے نہیں بن پڑتی ۔ مکان پر اشتہار لگ چکا ۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے ؟"

اصغری ۔ "آپ اس کا ہرگز فکر نہ کیجیے ۔ اگر ہزاری مل نے نالش کر دی ہے تو کچھ حرج نہیں ۔ اس کے روپے کی کچھ سبیل ہو جائے گی ۔ آپ اتنا فکر کیوں کرتی ہیں ؟ ہزاری مل کو جو اپنی طرف سے کرنا تھا کر چکا ۔"

ساس ۔ "کامل ہوتا تو میں اس کو ہزاری مل کے پاس بھیجتی ۔"

اصغری - "یوں آپ کو اختیار ہے لیکن میرے نزدیک مہاجن سے ڈرنا کسی طرح مناسب نہیں ، ورنہ اس کو آئندہ کے واسطے دلیری ہو جائے گی اور آئے دن نالش کا ڈراوا دکھایا کرے گا۔ سب سے بہتر یہ ہے کہ ادھر کا اشارہ نہ ہو اور باہر سے کوئی دباؤ اس پر پڑ جائے کہ وہ نالش کی پیروی سے باز رہے۔"

یہ بات سن کر محمد کامل کی ماں کو کسی قدر تسلی ہوئی۔ لیکن اصغری حیرت میں تھی کہ یہ کیا بات ہے اور اشتہار کا معاملہ بھی عجب ہے. میں گھر میں بیٹھی رہی۔ مجھ کو خبر نہیں۔ حاکم کا اشتہار ہوتا تو کوئی چپڑاسی پیادہ پکارتا۔ آواز دیتا۔

محمودہ سے اصغری نے کہا "جاؤ دروازے پر جو کاغذ لگا ہوا ہے اس کو چپکے سے اکھاڑ لاؤ۔ محمودہ کاغذ اکھاڑ لائی۔ اصغری نے پڑھا۔ تو صفائی کا حکم تھا نالش کا کچھ مذکور نہ تھا۔ سمجھ گئی کہ یہ بھی اس عظمت کی چالاکی ہے ، ساس پر تو حال ظاہر نہیں کیا۔ لیکن ان کا اچھی طرح اطمینان کر دیا کہ آپ دل جمعی سے بیٹھی رہیے۔ نالش کا ہرگز کھٹکا نہیں۔

شب برات کے بعد اصغری کے باپ کی آمد کی بات شروع ہوئی اور نو دس دن بات کی بات میں گزر گئے۔ رمضان سے چار دن پہلے دور اندیش خان[1] صاحب دہلی میں داخل ہوئے۔ اصغری نے پہلے سے اپنے باپ کی سن رکھی تھی اور ساس اور میاں سے ٹھہر گیا تھا کہ جس دن تحصیلدار صاحب آئیں گے اسی دن میں ان سے ملنے جاؤں گی جب اصغری کو باپ کے آنے کی خبر معلوم ہوئی فوراً ڈولی منگا جا پہنچیں۔ باپ نے گلے سے لگا لیا اور آب دیدہ ہوئے۔ دیر تک حال پوچھتے بتاتے رہے۔ غرض اس رات بھر اور اگلے دن بھر اصغری ماں کے یہاں رہی اور شام کے قریب باپ سے کہا کہ "اگر اجازت

---

[1] اصغری کے باپ کا نام۔

دیجیے تو آج میں چلی جاؤں ۔"

باپ نے کہا ۔ "ابھی ایک ہفتہ تو رہو ۔ ہم سمدھن کو کہلا بھیجیں گے ۔"

اصغری نے کہا "جیسا آپ ارشاد فرمائیں تعمیل کروں ۔ لیکن ابا جان[1] کے آنے سے پہلے گھر میں میرا موجود رہنا مصلحت معلوم ہوتا ہے ۔"

باپ نے سوچ کر کہا "ہاں بات تو ٹھیک ہے ۔"

غرض اصغری باپ سے رخصت ہوئی ۔ مغرب سے پہلے گھر آ موجود ہوئی اگلے دن کھانے کے وقت مولوی محمد فاضل صاحب محمد کامل کے باپ بھی آ پہنچے ۔ چونکہ اصغری بیاہ کے بعد مسرے کے سامنے نہیں ہوئی تھی مسرے کو آتا دیکھ کر کوٹھے پر جا بیٹھی ۔

ساس کوٹھے پر گئیں اور کہا "بیٹی چلو شرم کی کیا بات ہے ۔ تم تو ان کی گودوں میں کھیلی ہو ۔"

ساس کے کہنے سے اصغری اٹھ کر ساتھ ہو لی اور مسر کو جھک کر سلام کیا اور ادب سے علٰحدہ بیٹھ گئی ۔ مولوی صاحب نے کہا ۔ "خدا تمھاری عمر اور نیک بختی میں برکت دے ۔ اور حقیقت میں ہمارے گھر کے اچھے نصیب ہیں جو تم ہمارے گھر میں آئیں اور مجھے یقین ہوا کہ اس گھر کے کچھ دن پھرے اور ان شاءاللہ تمھاری مرضی اور تمھاری رائے کے موافق سب انتظام کیا جائے گا ۔"

غرض دو چار دن تو مولوی صاحب ملنے ملانے میں رہے پھر اول کے دو چار روز روزے کے سبب گھر کے کسی کام کی طرف متوجہ نہ ہوے ۔ ایک دن بہو کو بلا کر پاس بٹھایا اور ماما عظمت سے

---

1 ۔ مراد ہے اصغری کے خسر محمد فاضل سے ۔ انھیں بھی اصغری نے بلا بھیجا تھا ۔

کہا ۔ "ماما ہمارے رہتے سب حساب کتاب کر لو جس جس کا لینا دینا ہے سب لکھا دو تاکہ جس کو جتنا مناسب ہو دیا جائے اور جو باقی رہ جائے اس کی قسط بندی کر دی جائے ۔"

ماما نے کہا "ایک کا حساب ہو تو زبانی بھی یاد رکھا جائے بنیا ، بزاز ، قصائی ، کنجڑا ، حلوائی سب ہی کا دینا ہے بزاری مل کا بڑا بھاری حساب الگ ہے جس کو جتنا دینا ہو مجھ کو دیجیے ۔ لیجا کر آپ کے نام جمع کرا دوں ۔"

مولوی صاحب تو سیدھے سادھے آدمی تھے دینے کو آمادہ ہو گئے ، اصغری نے کہا یوں علی الحساب دینے سے کیا فائدہ ۔ پہلے ہر ایک کا قرضہ معلوم ہو ۔ تب اس کو سوچ سمجھ کر دینا چاہیے ۔"

ماما نے کہا "کھانے سے فراغت پاؤں تو جا کر ہر ایک سے پوچھ آؤں گی ۔"

اصغری ۔ "پوچھ آنے سے کیا ہوگا ؟ جس کو لینا ہو یہاں آ کر حساب کر جائے ۔"

ماما "بیوی آپ نے تو ایک بات کہہ دی ۔ اب میں کہاں کہاں بلاتی پھروں ۔ اور وہ لوگ اپنے دھندے سے کب چھٹی پاتے ہیں جو میرے ساتھ چلے آئیں گے ؟"

اصغری "ماما کوئی روز روز کا بلانا نہیں ہے ۔ ایک دن کی بات ہے جا کر بلا لاؤ ۔ شام کے کھانے کا کچھ بندوبست ہو جائے گا ۔ تم آج یہی کام کرو اور لینے والے تو دینے کا نام سن کر دوڑیں گے بزاری مل نالش کرنے کو دو دو کوس پر کچہری تو گیا ، یہاں آتے کیا اس کے پاؤں میں منہدی لگی ہے ؟ اور دور کون ہے ۔ کنجڑا، قصائی ، بنیا ، حلوائی سب اسی گلی میں ہیں ۔ صرف بزاز اور بزاری مل دور ہیں ان کو کل پر رکھو یہ پھٹکل حساب آج طے ہو جائے ۔"

ماما عظمت کی کسی طرح مرضی نہ تھی کہ حساب ہو - لیکن اصغری نے باتوں میں ایسا دبایا کہ کچھ جواب نہ بن پڑا - سب سے پہلے حلوائی آیا پوچھا "لالہ! تمھارا کیا پانا ہے -؟" حلوائی - "تیس روپے -"

پوچھا گیا - "کیا کیا چیز تمھارے یہاں سے آئی ہے -؟ تیس روپے تو بہت زیادہ بتاتے ہو -"

حلوائی - "صاحب تیس روپے بھی کچھ بہت ہوتے ہیں - ایک رقم دس سیر شکر تو اسی شب برات کو آئی -"

محمد کامل کی ماں - "ارے کیسی شکر؟ اب کے مرتبہ تو ہمارے گھر جو کچھ پکا پکایا بازار سے نقد آیا -"

یہ سن کر ماما عظمت کا رنگ فق ہو گیا اور حلوائی سے بولی ,, وہ دس سیر شکر تو نے ان کے حساب میں کیوں لکھ لی؟ وہ تو میں دوسرے کے واسطے لے گئی تھی - اور تجھ کو جتا بھی دیا تھا -"

حلوائی - مجھ سے تو تم نے کسی گھر کا نام نہیں لیا - اسی سرکار کے نام سے لائی ہو - ورنہ مجھے کیا فائدہ تھا کہ دوسرے کی چیز ان کے نام لکھتا اور مجھ سے تو اور کسی سرکار سے اچاپت بھی نہیں -"

غرض ماما کھسیانی باتیں کرنے لگی - مولوی صاحب نے کہا "بھلا شکر کی رقم تو رہنے دو - اور چیزیں بتاؤ -"

غرض اسی طرح بہت سی چیزیں اس نے بتائیں جو عمر بھر گھر میں نہیں آئی تھیں چار سیر بالو شاہی مولود شریف کے واسطے اور مزہ یہ کہ یہاں کبھی کسی نے مولود کی مجلس نہیں کی - صرف چھے سات روپے تو سچ نکلے باقی سب جھوٹ - مولوی صاحب کا جی جل گیا اور بے طرح ان کو غصہ آیا اور پوچھا - "کیوں ری نمک حرام

عظمت ، ایسا ہی دنیا بھر کا قرض تو نے اس گھر پر کر رکھا ہے اور یوں تو نے گھر کو خاک میں ملایا ہے ۔"

حلوائی ہو چکا تو کنجڑا آیا ۔ اس نے کہا ۔ "میاں میرا تو حساب معمولی ہے دو آنے روز کی ترکاری ۔"

محمد کامل کی ماں ۔ "ارے سیر بھر ترکاری میرے گھر میں آتی ہے ۔ دو آنہ روز کی ہوئی ؟"

کنجڑا ۔ "حضرت میری دکان سے ماما تین سیر لاتی ہے ۔"

ماما ۔ "ہاں تین سیر لاتی ہوں ۔ سیر بھر تمہارے نام سے ۔ سیر بھر اپنی بیٹی کے واسطے اور سیر بھر دوسرے گھر کے واسطے ۔ میں کیا مکرتی ہوں ؟ یہ موا سب تمہارے نام بتاتا ہے ۔"

کنجڑا ۔ "اری بڑھیا بے ایمان ! ہمیشہ سے تو اسی گھر کے حساب میں تین سیر لاتی رہی اور جب روپیہ ملا اسی گھر سے ملا ۔"

قصائی اور بنیے کا حساب ہوا تو اس میں بھی ہزاروں فریب نکلے اور ثابت ہوا کہ ماما اسی گھر کے سودے میں اپنی بیٹی خیراتن اور اپنی دو تین ہمسایوں کے گھر پورے کرتی تھی ۔ اس گھر کے نام سے سودا لاتی اور دوسری جگہ بیچ ڈالتی ۔ غرض شام تک پھٹکل حساب ہوا اور اب بزاز اور بزاری مل باقی رہے ۔ مولوی صاحب نے کہا ۔ " اب نا وقت ہوگیا ہے ۔ آج ملتوی کرو کل دیکھا جائے گا ۔ " لیکن مولوی صاحب نے آہستہ سے یہ بھی کہا کہ "ایسا نہ ہو عظمت بھاگ جائے ۔"

اصغری ۔ " گھر بار لڑکے بچے مکان چھوڑ کر کہاں بھاگ جائے گی ہاں شاید غیرت مند ہو تو کچھ کھا پی لے مگر ایسی غیرت مند ہوتی تو ایسا کام کیوں کرتی تاہم حفاظت ضرور ہے لیکن فقط اس قدر کہ باہر آتی جاتی کو کوئی دیکھتا رہے ۔"

مولوی صاحب کے خدمت گار جو ساتھ آئے تھے ایک کو چپکے سے کہہ دیا کہ ماما کو آتے جاتے دیکھتے رہو۔ جب کھانے سے فارغ ہوئی۔ ماما چپکے سے اٹھ باہر چلی۔ خدمت گار دبے پاؤں پیچھے پیچھے ساتھ ہوا۔ ماما پہلے تو اپنے گھر گئی اور وہاں سے کچھ بغل میں مار تیر کی طرح سیدھی بزاز کے مکان پر جا کر اس کو آواز دی بزاز گھبرا کر باہر نکلا کہ " بڑی بی تم اس وقت کہاں ؟ "

عظمت " مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ جس جس کا دینا ہے سب کا حساب ہوتا ہے۔ کل تم بھی بلائے جاؤ گے تو ایسی بات مت کرنا جس میں میری فضیحت ہو۔"

بزاز ۔ " حساب میں تمہاری فضیحت کی کیا بات ہے۔"

ماما ۔ " لالہ تم تو جانتے ہو یہ کمبخت لالچ بہت برا ہوتا ہے۔ سرکار کے حساب میں اپنے واسطے بھی تمہاری دکان سے کبھی کبھی لٹھا، نین سکھ اور دریس لے گئی ہوں۔"

بزاز ۔"کیا معلوم تم اپنے واسطے کیا لے گئی ہو ؟ "

ماما ۔ " مجھ کو اس وقت حساب کرنے کا تو ہوش نہیں لیکن دو چار تھان دریس، لٹھے اور نین سکھ کے اور دس گز اوداقند میرے حساب میں نکلے گا تو میرے ہاتھ کی چار چوڑیاں سولہ روپے کی ہیں۔ گھس گھسا کر ایک روپیہ کم ہو گیا ہوگا۔ پندرہ روپے میرے نام سے کم کر دینا اور دو چار روپے اور جو میرے نام نکلیں گے میں دینے کو موجود ہوں۔"

بزاز ۔"چوڑیاں تم دیتی ہو۔ خیر میں لے لیتا ہوں۔ لیکن رات کا وقت ہے۔"

عظمت ۔ " اس وقت میری عزت تمہارے ہاتھ ہے جس طرح ہو سکے بچاؤ۔"

بزاز سے رخصت ہو سیدھی بزاری مل کے گھر پہنچی وہ بھی حیران ہوا اور بولا کہ اس وقت تم کہاں ؟ اس کے پاؤں پڑ کر رو کر کہنے لگی کہ " مجھ سے ایک خطا ہوگئی ہے ۔"

بزاری مل ۔ " وہ کیا ؟ "

عظمت ۔ " تم وعدہ کرو کہ معاف کر دو گے تو میں کہوں "

بزاری مل ۔ "بات تو کہو"

عظمت ۔ " چار مہینے ہوئے لاہور سے خرچ آیا تھا اور مولوی صاحب نے سو روپے تم کو بھیجے تھے وہ میرے پاس خرچ ہوگئے اور سرکار میں ڈر کے مارے میں نے ظاہر نہیں کیا ۔ اب مولوی صاحب آئے ہوئے ہیں تم کو حساب کے واسطے طلب کریں گے میں اس روپے کا ٹھکانا لگا دوں گی تم اس رقم کو ظاہر مت کرنا ۔"

بزاری مل ۔" دو چار روپے کی بات ہوتی تو میں چھپا بھی لیتا ۔ اکٹھے سو روپے تو میرے کیے چھپ نہیں سکتے ۔"

ماما ۔" کیا سو روپے کا بھی میرا اعتبار نہیں ۔"

بزاری مل ۔" صاف بات تو یہ ہے کہ تمھارا ایک کوڑی کا بھی اعتبار نہیں جس گھر سے تم نے عمر بھر پرورش پائی آن ہی کے ساتھ تم نے یہ سلوک کیا تو دوسرے کے ساتھ کب چوکنے والی ہو ۔"

عظمت ۔ "ہاں لالہ جب برا وقت سر پر آتا ہے تو اپنے دشمن ہو جاتے ہیں ۔ خیر اگر تم کو اعتبار نہیں تو لو یہ میری بیٹی کی پہنچیاں اور جوشن رکھ لو ۔"

بزاری مل ۔ " ہاں یہ معاملے کی بات ہے لیکن دن ہو تو مال پرکھا جائے ۔ تب معلوم ہو کتنے کا ہے لیکن اٹکل سے تو سب مال پچاس ساٹھ کا ہوگا "

ماما عظمت - " ایسا غضب تو مت کرو - سوا سو کی لاگت کے ہیں -"

بزاری مل - " اس میں برا ماننے کی کیا بات ہے ؟ تمھاری چیز سو کی ہو یا دو سو کی - کوئی نکالے لیتا ہے ؟ تلوانے سے جتنی ٹھیرے معلوم ہو جائے گا -"

یہ سب بندوبست کر کے ماما گھر واپس آئی اور مولوی صاحب کے خدمت گار نے پاؤں دبانے میں یہ سب حال مولوی صاحب سے بیان کیا اور محمد کامل کی ماں کے ذریعہ اصغری کو بھی معلوم ہوا - صبح ہوئی تو بزاز اور بزاری مل طلب ہوئے - حساب میں کچھ حجت ہونے لگی - ماما چڑھ چڑھ کر بولتی تھی - بزاز نے کہا "تو بڑھیا ٹر ٹر کیوں کرتی ہے - اٹھا اپنی چوڑیاں - تو تو پندرہ روپے کی بتاتی تھی - بازار میں نو روپے کی آنکتے ہیں - "بزاری مل نے پہنچیاں اور جوشن سامنے رکھ دیے اور عظمت سے کہا "نہیں صاحب یہ مال ہمارے کام کا نہیں -"

مولوی صاحب نے بزاز اور بزاری مل دونوں سے پوچھا : "کیوں بھائی یہ چیزیں کیسی ہیں ؟ " تب دونوں نے رات کی حکایت بیان کی اور عظمت کے منہ پر گویا لاکھوں جوتیاں پڑ رہی تھیں - جب حساب طے ہوگیا اور مولوی صاحب نے دینے کو روپیہ نکالا تو جتنا واجبی تھا آدھا آدھا سب کا دے دیا اور کہا کہ میں نے روپیہ منگایا ہے دس پانچ دن میں آتا ہے تو باقی بھی دے دیا جائے گا - سب لوگوں نے پوچھا کہ اور ماما کی طرف جو ہمارا نکلا وہ ہم کس سے لیں ؟

غرض مولوی صاحب نے لوگوں سے کہا کہ جو ماما سے لینا ہے وہ ماما سے لو اور عظمت کی طرف متوجہ ہو کر بولے - "حضرت ان کا روپیہ ادا کرو -"

عظمت نے نیچی آنکھیں کر کے کہا " میرے پاس بیٹی کا زیور ہے اس میں یہ لوگ اپنا اپنا سمجھ بوجھ لیں ۔ " بیٹی کا تمام زیور تو کنجڑے ، قصائی ، بنیے ، بزاز کے حساب میں آدھے داموں پر لگ گیا ۔ ہزاری مل کے سو روپے کے واسطے رہنے کا ٹھیکرا گروی رکھنا پڑا ۔ لکھا پڑھی پکے کاغذ پر ہو کر چار بھلے مانسوں کی گواہی ہوگئی ۔ مولوی صاحب نے عظمت سے کہا " بس اب آپ خیر سے سدھاریے تم ایسے نمک حرام ، دغا باز ، بے ایمان آدمی کا ہمارے گھر میں کچھ کام نہیں ۔"

اصغری ۔ " ان میں نمک حرامی کے علاوہ ایک صفت اور بھی تھی ۔ وہ یہ کہ گھر میں فساد ڈلوانے کی فکر میں تھیں ۔ کیوں عظمت وہ کڑاہی کی بات یاد ہے جو محمودہ کے بھائی نے فرمائش کی تھی اور تو نے میری طرف سے جھوٹ جا کر کہہ دیا تھا کہ بہو کہتی ہیں میرے سر میں درد ہے ؟ بول تو سہی کب تو نے مجھ سے کہا تھا اور کب میں نے درد سر کا عذر کیا تھا ۔"

عظمت ۔ " بیوی تم کوٹھے پر قرآن پڑھ رہی تھیں ۔ میں کہنے کو اوپر گئی تم کو پڑھتے دیکھ کر الٹی پھر آئی ۔"

اصغری ۔ " اور درد سر کی بات دل سے بنائی ۔"

عظمت ۔ " میں نے سوچا کہ صبح سے اب تک تو تم پڑھ رہی ہو اب کہاں چولھے میں سر کھپاؤ گی ۔"

پھر اصغری نے اشتہار نکال کر مولوی صاحب کے سامنے ڈال دیا اور کہا " دیکھیے یہ بیوی عظمت ان گنوں کی ہیں ۔ خود تو محلے کے پھاٹک سے اشتہار اکھاڑ لائی اور مکان پر لگایا اور خود اماں جان سے کہنے کو دوڑی گئی ۔"

اصغری یہ باتیں کہہ رہی تھی اور مولوی صاحب کا چہرہ سرخ ہو ہو جاتا تھا ادھر مولوی صاحب نے کہا " تجھ کو نکال

دینا کافی نہیں ۔ تو بڑی بد ذات عورت ہے ۔" یہ کہہ کر اپنے خدمت گار کو آواز دی اور کہا "بہادر! اس ناپاک کو کوتوالی میں لے جا ، رقعے میں اس کا سب حال ہم لکھ دیتے ہیں ۔"

اصغری نے مولوی صاحب سے کہا کہ " بس اب یہ اپنی سزا کو پہنچ گئی ۔ کوتوالی سے اس کو معاف رکھیے اور ماما کو اشارہ کیا " چل دے " بلکہ دروازے تک ماما کے ساتھ گئی ۔

غرض ماما عظمت اپنے کوتکوں کے پیچھے یہاں سے نکالی گئی ۔ گھر پہنچی ، تو بیٹی بلا کی طرح لپٹی ۔ "میں نہ کہتی تھی اماں ایسی لوٹ تو نہ مچاؤ ۔ سو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا ۔ ایسا نہ ہو کسی دن پکڑی جاؤ ۔ تم کسی کی مانتی تھیں ۔ خوب ہوا ۔ جیسا کیا ویسا پایا اب سسرال میں میرا نام تو بد مت کرو ۔ جہاں تمہارا خدا لے جائے چلی جاؤ ۔ میرے گھر میں تمہارا کام نہیں ۔ زیور کو میں نے صبر کیا تقدیر میں ہوگا تو پھر مل رہے گا ۔" اس طور پر خدا خدا کر کے اصغری نے اپنے دشمن کو نکال پایا اور گھر کو عذاب سے نجات دی ۔

خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۳ء تا ۱۹۵۵ء)

بنت بہادر شاہ

یہ ایک بیچاری درویشنی کی سچی بپتا ہے، جو زمانے کی گردش سے ان پر گزری - ان کا نام کلثوم زمانی بیگم تھا - یہ دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ کی لاڈلی بیٹی تھیں - چند سال ہوے ان کا انتقال ہوگیا - میں نے بارہا شہزادی صاحبہ سے خود ان کی زبانی ان کے حالات سنے ہیں کیوں کہ ان کو ہمارے حضور نظام الدین اولیاء محبوب الٰہیؒ سے خاص عقیدت تھی - اس لیے اکثر حاضر ہوتی تھیں اور مجھ کو ان کی دردناک باتیں سننے کا موقع ملتا تھا - نیچے جس قدر واقعات لکھے گئے ہیں وہ یا تو خود ان کے بیان کردہ ہیں یا ان کی صاحب زادی زینب زمانی بیگم کے جو اب تک زندہ ہیں اور پنڈت کے کوچے میں رہتی ہیں اور وہ حالات یہ ہیں:

جس وقت میرے بابا جان کی بادشاہت ختم ہوئی اور تاج و تخت لٹنے کا وقت قریب آیا تو دہلی کے لال قلعے میں ایک کہرام مچا ہوا تھا - در و دیوار پر حسرت برستی تھی - اجلے اجلے سنگ مرمر کے

مکان کالے سیاہ نظر آتے تھے - تین وقت سے کسی نے کچھ کھایا نہ
تھا - زینب میری گود میں ڈھائی برس کا بچہ تھی اور دودھ کے لیے
بلکتی تھی - فکر اور پریشانی کے مارے نہ میرے دودھ رہا تھا نہ
کسی انا کے - ہم سب اسی یاس و ہراس کے عالم میں بیٹھے تھے
کہ حضرت ظل سبحانی کا خاص خواجہ سرا ہم کو بلانے آیا - آدھی
رات کا وقت ، سناٹے کا عالم ، گولوں کی گرج سے دل سہمے جاتے
تھے لیکن حکم سلطانی ملتے ہی ہم حاضری کے لیے روانہ ہوگئے -
حضور مصلے پر تشریف رکھتے تھے - تسبیح ہاتھ میں تھی - جب میں
سامنے پہنچی ، جھک کر تین مجرے بجا لائی - حضور نے نہایت شفقت
سے قریب بلایا اور فرمانے لگے : کلثوم ! لو اب تم کو خدا کو سونپا -
قسمت میں ہے تو پھر دیکھ لیں گے ، تم اپنے خاوند کو لے کر فوراً
کہیں چلی جاؤ میں بھی جاتا ہوں - جی تو نہیں چاہتا کہ اس آخری
وقت میں تم بچوں کو آنکھ سے اوجھل ہونے دوں - پر کیا کروں ساتھ
رکھنے میں تمھاری بربادی کا اندیشہ ہے ، الگ رہو گی تو شاید خدا
کوئی بہتری کا سامان پیدا کر دے -

" اتنا فرما کر حضور نے دست مبارک دعا کے لیے بلند کیے جو
رعشے کے سبب کانپ رہے تھے اور دیر تک آواز سے بارگاہ الٰہی میں
عرض کرتے رہے : "خداوندا ! یہ بے وارث بچے تیرے حوالے کرتا
ہوں یہ محلوں کے رہنے والے جنگل ویرانوں میں جاتے ہیں - دنیا میں
ان کا کوئی یار و مددگار نہیں رہا - تیمور کے نام کی عزت رکھیو اور
ان بے کس عورتوں کی آبرو بچائیو - پروردگار ! یہی نہیں بلکہ ہندو
مسلمان سب میری اولاد ہیں اور آج کل سب پر مصیبت چھائی ہے -
میرے اعمال کی شامت سے ان کو رسوا نہ کر اور سب کو پریشانیوں
سے نجات دے -"

" اس کے بعد میرے سر پر ہاتھ رکھا ، زینب کو پیار کیا اور

پیش آئے گا - زینب پیاس کے مارے رو رہی تھی - سامنے سے ایک زمیندار نکلا - میں نے بے اختیار ہو کر آواز دی ، "بھائی تھوڑا سا پانی اس بچی کو لادے"۔ زمیندار فوراً ایک مٹی کے برتن میں پانی لایا اور بولا "آج سے تُو میری بہن اور میں تیرا بھائی"۔ یہ زمیندار کورالی کا کھاتا پیتا آدمی تھا - اس کا نام بستی تھا - اس نے اپنی بیل گاڑی تیار کر کے ہم کو سوار کیا اور پوچھا کہ جہاں تم کہو پہنچا دوں - ہم نے کہا کہ اجاڑہ ضلع میرٹھ میں میر فیض علی ، شاہی حکیم رہتے ہیں ، جن سے ہمارے خاندان کے خاص مراسم ہیں ،وہاں لے چل - بستی ہم کو اجاڑہ لے گیا ، مگر میر فیض علی نے ایسی بے مروتی کا برتاؤ کیا جس کی کوئی حد نہیں - صاف کانوں پر ہاتھ رکھ لیے کہ میں تم لوگوں کو ٹھہرا کر اپنا گھر بار تباہ نہیں کرنا چاہتا -

"وہ وقت بڑی مایوسی کا تھا - ایک تو یہ خطرہ کہ پیچھے سے انگریزی فوج آتی ہوگی ، اس پر بے سروسامانی کا یہ عالم کہ ہر شخص کی نگاہ پھری ہوئی تھی - وہ لوگ جو ہماری آنکھوں کے اشاروں پر چلتے اور ہر وقت دیکھتے رہتے تھے کہ ہم جو کچھ حکم دیں فوراً پورا کیا جائے ، وہی آج ہماری صورت سے بیزار تھے - شاباش ہے بستی زمیندار کو کہ اس نے زبانی بہن کہنے کو آخر تک نبھایا اور ہمارا ساتھ نہ چھوڑا ، ناچار اجاڑے سے روانہ ہو کر حیدرآباد کا رخ کیا - عورتیں بستی کی گاڑی میں سوار تھیں اور مرد پیدل چل رہے تھے - تیسرے روز ایک ندی کے کنارے پہنچے جہاں کومل کے نواب کی فوج پڑی ہوئی تھی - انھوں نے جو سنا کہ ہم شاہی خاندان کے آدمی ہیں تو بڑی خاطر کی اور ہاتھی پر سوار کر کے ندی سے پار اتارا - ابھی ہم ندی کے پار اترے ہی تھے کہ سامنے سے انگریزی فوج آگئی اور نواب کی فوج سے لڑائی ہونے لگی -

"میرے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے چاہا کہ نواب کی فوج

میں شامل ہو کر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جائیے - ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے - سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی - ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے - ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا ہم لوگ وہاں سے نکل بھاگے پر ہائے! کیسی مصیبت تھی کہ ہم کو بھاگنا بھی نہیں آتا تھا - گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے - سر کی چادریں وہیں رہ گئیں - برہنہ سر ، حواس باختہ ، ہزار دقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خونم خون ہوگئے - پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں ، زینب پر غشی کا عالم تھا - مرد ہم کو سنبھالتے تھے ، مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا -

"نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہوگئیں - میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں - کہیں سہارا نظر نہیں آتا - قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہوگئی لیکن فقیروں کو چین و اطمینان ہوتا ہے ، یہاں وہ بھی نصیب نہیں "

" فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی - بستی ، ندی سے پانی لایا ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا نور محل رونے لگیں اور بولیں ابھی خواب میں تمھارے بابا حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق و زنجیر پہنے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ : "آج ہم غریبوں کے لیے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرش مخمل سے بڑھ کر ہے - نور محل ! گھبرانا نہیں ہمت سے کام لینا - تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں - ذرا میری کلثوم کو دکھا دو - جیل خانے جانے سے پہلے اُسے دیکھوں گا -"

میں شامل ہوکر لڑیں مگر رسالدار نے کہلا بھیجا کہ آپ عورتوں کو لے کر جلدی چلے جائیے - ہم جیسا موقع ہوگا بھگت لیں گے - سامنے کھیت تھے جن میں پکی ہوئی تیار کھیتی کھڑی تھی - ہم لوگ اس کے اندر چھپ گئے - ظالموں نے خبر نہیں دیکھ لیا تھا یا ناگہانی طور پر گولی لگی جو کچھ بھی ہوا ایک گولی کھیت میں آئی جس سے آگ بھڑک اٹھی اور تمام کھیت جلنے لگا ہم لوگ وہاں سے نکل بھاگے پر ہائے! کیسی مصیبت تھی کہ ہم کو بھاگنا بھی نہیں آتا تھا - گھاس میں اُلجھ اُلجھ کر گرتے تھے - سر کی چادریں وہیں رہ گئیں - برہنہ سر، حواس باختہ، ہزار دقت سے کھیت کے باہر آئے میرے اور نواب نور محل کے پاؤں خونم خون ہوگئے - پیاس کے مارے زبانیں باہر نکل آئیں، زینب پر غشی کا عالم تھا - مرد ہم کو سنبھالتے تھے، مگر ہمارا سنبھلنا مشکل تھا -

"نواب نور محل تو کھیت سے نکلتے ہی چکرا کر گر پڑیں اور بے ہوش ہوگئیں - میں زینب کو چھاتی سے لگائے اپنے خاوند کا منہ تک رہی تھی اور دل میں کہتی تھی کہ الٰہی ہم کہاں جائیں - کہیں سہارا نظر نہیں آتا - قسمت ایسی پلٹی کہ شاہی سے گدائی ہوگئی لیکن فقیروں کو چین و اطمینان ہوتا ہے، یہاں وہ بھی نصیب نہیں"

"فوج لڑتی ہوئی دور نکل گئی تھی - بستی، ندی سے پانی لایا ہم نے پیا اور نواب نور محل کے چہرے پر چھڑکا نور محل رونے لگیں اور بولیں ابھی خواب میں تمھارے بابا حضرت ظل سبحانی کو دیکھا ہے کہ طوق و زنجیر پہنے کھڑے ہیں اور کہتے ہیں کہ: "آج ہم غریبوں کے لیے یہ کانٹوں بھرا خاک کا بچھونا فرش مخمل سے بڑھ کر ہے - نور محل! گھبرانا نہیں ہمت سے کام لینا - تقدیر میں لکھا تھا کہ بڑھاپے میں یہ سختیاں برداشت کروں - ذرا میری کلثوم کو دکھا دو - جیل خانے جانے سے پہلے اُسے دیکھوں گا -"

" بادشاہ کی یہ باتیں سن کر میں نے ہائے کا نعرہ مارا اور آنکھ کھل گئی - کلثوم ! کیا سچ مچ ہمارے بادشاہ کو زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوگا "- مرزا عمر سلطان نے اس کا جواب دیا کہ خواب و خیال ہے - بادشاہ لوگ ، بادشاہوں کے ساتھ ایسی بد سلوکیاں نہیں کیا کرتے - تم گھبراؤ نہیں وہ اچھے حال میں ہوں گے - حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن بولیں: "یہ موئے فرنگی بادشاہوں کی قدر کیا خاک جانیں گے - خود اپنے بادشاہ کا سر کاٹ کر سولہ آنے کو بیچتے ہیں (سکے کی طرف اشارہ ہے جس میں بادشاہ کے سر کی مورت ہوتی ہے) بوا نور محل ! تم نے تو طوق و زنجیر پہنے دیکھا ہے میں کہتی ہوں کہ بنیے بقالوں سے تو اس سے بھی زیادہ بد سلوکی دور نہیں "- مگر میرے شوہر مرزا ضیاءالدین نے تسکین دلاسے کی باتیں کرکے سب کو مطمئن کر دیا - اتنے میں بستی ، ناؤ میں گاڑی کو اس پار لے آیا اور ہم سوار ہوکر روانہ ہوئے - تھوڑی دور جا کر شام ہوگئی اور ہماری گاڑی ایک گؤں میں جا کر ٹھہری جس میں مسلمان راجپوتوں کی آبادی تھی - گاؤں کے نمبردار نے ایک چھپر ہمارے واسطے خالی کرا دیا جس میں سوکھی گھاس اور پھوس کا بچھونا تھا - وہ لوگ اسی گھاس پر جس کو پیال یا پرال کہتے تھے ، سوتے ہیں - ہم کو بھی بڑی خاطر داری سے (جو ان کے خیال میں بڑی خاطر تھی) یہ نرم بچھونا دیا گیا -

"میرا تو اس کوڑے سے جی الجھنے لگا - پر کیا کرتے اس وقت سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا - ناچار اسی میں پڑ رہے - دن بھر کی تکلیف اور تکان کے بعد اطمینان اور بے فکری میسر آئی تھی نیند آ گئی - آدھی رات کو ایکا ایکی ہم سب کی آنکھ کھل گئی - گھاس کے تنکے سوئیوں کی طرح بدن میں چبھ رہے تھے اور پسو جگہ جگہ کاٹ رہے تھے - اس وقت کی بے کلی بھی خدا کی پناہ پسوؤں نے تمام بدن میں آگ لگا دی تھی - مخملی تکیوں ، ریشمی

نرم نرم بچھونوں کی عادت تھی اس لیے تکلیف ہوئی ورنہ ہم ہی جیسے وہ گاؤں کے آدمی تھے جو بے غل و غش اسی گھاس پر پڑے سوتے تھے - اندھیری رات میں چاروں طرف گیدڑوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور میرا دل سہما جاتا تھا - قسمت کو پلٹتے دیر نہیں لگتی کون کہ سکتا تھا کہ ایک دن شہنشاہ ہند کے بال بچے یوں خاک پر بسیرے لیتے پھریں گے - قصہ مختصر اسی طرح منزل بہ منزل تقدیر کی گردشوں کا تماشا دیکھتے ہوے حیدر آباد پہنچے اور سیتا رام پیٹھ میں ایک مکان کرائے کو لے کر ٹھہرے - جبل پور میں میرے شوہر نے ایک جڑاؤ انگوٹھی جو لوٹ کھسوٹ سے بچ گئی تھی فروخت کی اسی میں راستے کا خرچ چلا اور چند روز یہاں بھی بسر ہوے ، آخر تا بہ کے ، جو کچھ تھا ختم ہوگیا - اب فکر ہوئی کہ پیٹ بھرنے کا کیا حیلہ کیا جائے - میرے شوہر اعلیٰ درجے کے خوش نویس تھے - انھوں نے درود شریف خط ریحان میں لکھا اور چار مینار پر ہدیہ کرنے لے گئے - لوگ اس خط کو دیکھتے تھے اور حیرت میں رہتے تھے - اول روز پانچ روپے کو درود شریف ہدیہ ہوا - اس کے بعد یہ قاعدہ ہوا کہ جو کچھ لکھتے کمتی بڑھتی فوڑا بک جاتا - اس طرح ہماری گزر اوقات بہت عمدگی سے ہونے لگی لیکن موسیٰ ندی کے چڑھاؤ سے ڈر کر شہر میں داروغہ احمد کے مکان میں اٹھ آئے - یہ شخص حضور نظام کا خاص ملازم تھا - اس کے بہت سے مکان کرائے پر چلتے تھے -

"چند روز بعد خبر آڑی کہ نواب لشکر جنگ جس نے شہزادوں کو اپنے پاس پناہ دی تھی ، انگریزوں کے عتاب میں آ گیا ہے اور اب کوئی شخص دہلی کے شہزادوں کو پناہ نہیں دے گا - بلکہ جس کسی کو شہزادے کی خبر ملے گی اس کو گرفتار کرانے کی کوشش کرے گا - ہم سب اس خبر سے گھبرا گئے اور میں نے اپنے شوہر کو باہر نکلنے سے روک دیا کہ کہیں کوئی دشمن پکڑوا نہ دے - گھر میں

بیٹھے بیٹھے فاقوں کی نوبت آ گئی تو ناچار ایک نواب کے لڑکے کو قرآن پڑھانے کی نوکری میرے شوہر نے بارہ روپے ماہوار پر کر لی - چپ چاپ اس کے گھر چلے جاتے اور پڑھا کر آ جاتے - مگر وہ نواب اس قدر بدمزاج تھا کہ ہمیشہ معمولی نوکروں کی طرح میرے شوہر کے ساتھ برتاؤ کرتا تھا - جس کی برداشت وہ نہیں کر سکتے تھے اور گھر میں آ کر رو رو کر دعا مانگتے کہ الٰہی اس ذلت کی نوکری سے تو موت لاکھ درجہ بڑھ کر ہے - تو نے اتنا محتاج بنا دیا - کل تو اس نواب جیسے سیکڑوں ہمارے غلام تھے ، پر آج ہم اس کے غلام ہیں - اسی اثناء میں کسی نے میاں نظام الدین صاحب کو ہماری خبر کر دی ، میاں کی حیدر آباد میں بڑی عزت تھی کیوں کہ میاں حضرت کالے میاں صاحب چشتی نظامی فخری کے صاحبزادے تھے جن کو بادشاہ دہلی اور نظام اپنا اپنا پیر تصور کرتے تھے - میاں رات کے وقت میانے میں سوار ہو کر ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم کو دیکھ کر بہت روئے - ایک زمانہ تھا جب وہ قلعے میں تشریف لاتے تھے تو مسند زرنگار پر بٹھائے جاتے تھے - بادشاہ بیگم اپنے ہاتھ سے لونڈیوں کی طرح مگس رانی کرتی تھیں - آج وہ گھر میں آئے تو ثابوت بوریا بھی نہ تھا جس پر وہ آرام سے بیٹھ جاتے - پچھلا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگا - خدا کی شان کیا تھا اور کیا ہو گیا - میاں بہت دیر تک حالات دریافت فرماتے رہے - اس کے بعد تشریف لے گئے - صبح کو پیام آیا کہ ہم نے خرچ کا انتظام کروا دیا ہے ، اب تم حج کا ارادہ کر لو ، یہ سن کر جی باغ باغ ہو گیا اور مکہ معظمہ کی تیاریاں ہونے لگیں - القصہ ، حیدر آباد سے روانہ ہو کر بمبئی آئے اور یہاں اپنے سچے رفیق بستی کو خرچ دے کر اس کے گھر رخصت کر دیا - جہاز میں سوار ہوئے - جو مسافر یہ سنتا تھا کہ یہ شاہ ہند کے گھرانے کے ہیں تو ہمارے دیکھنے کا شوق ظاہر کرتا تھا - اس وقت ہم سب درویشانہ رنگین لباس میں تھے - ایک ہندو نے جس کی

شاید عدن میں دکان تھی اور جو ہمارے حال سے بے خبر تھا ، پوچھا کہ تم لوگ کس پنتھ کے فقیر ہو ۔ اس کے سوال نے زخمی دل پر نمک چھڑک دیا ، میں بولی : "ہم مظلوم شاہ گرو کے چیلے ہیں ۔ وہی ہمارا باپ تھا اور وہی ہمارا گرو ۔ پاپی لوگوں نے اس کا گھر بار چھین لیا اور ہم کو اس سے جدا کر کے جنگلوں میں نکال دیا ۔ اب وہ ہماری صورت کو ترستا ہے اور ہم اس کے درشنوں بغیر بے چین ہیں ۔ اس سے زیادہ اور کیا اپنی فقیری کی حالت بیان کریں ۔"

"جب اس نے ہماری اصلی کیفیت لوگوں سے سنی تو بے چارہ رونے لگا اور بولا "بہادر شاہ ہم سب کا باپ اور گرو تھا ۔ کیا کریں رام جی کی یہی مرضی تھی کہ وہ بے گناہ برباد ہو ۔"

"مکے پہنچے تو اللہ میاں نے ٹھہرنے کا ایک عجیب ٹھکانہ پیدا کر دیا ۔ عبدالقادر نامی میرا ایک غلام تھا ، جس کو میں نے آزاد کر کے مکے بھیج دیا تھا ۔ یہاں آ کر اس نے بڑی دولت کمائی اور زم زم کا داروغہ ہو گیا ۔ اس کو جو ہمارے آنے کی خبر ملی ۔ دوڑا ہوا آیا اور قدموں پر گر کر خوب رویا ۔ اس کا مکان بہت اچھا اور آرام کا تھا ۔ ہم سب وہیں ٹھہرے ۔ چند روز کے بعد سلطان روم کے نائب کو جو مکے میں رہتا ہے ہماری خبر ہوئی ، تو وہ بھی ہم سے ملنے آیا ۔ کسی نے اس سے کہا تھا کہ شاہ دہلی کی لڑکی آئی ہے ، جو بے حجابانہ باتیں کرتی ہے ۔ نائب سلطان نے عبدالقادر کے ذریعے سے ملاقات کا پیام دیا ۔ جو میں نے منظور کیا ۔ دوسرے دن وہ ہمارے گھر پر آیا اور نہایت ادب قاعدے سے بات چیت کی ۔ آخر میں اس نے خواہش کی کہ میں آپ کے آنے کی اطلاع حضور سلطان کو دینا چاہتا ہوں ، میں نے اس کا جواب بے پروائی سے دیا کہ اب ہم ایک بڑے سلطان کے دربار میں آ گئے ہیں ۔ اب ہمیں کسی دوسرے سلطان کی پروا نہیں ہے ۔ نائب نے ایک معقول رقم ہمارے

اخراجات کے لیے مقرر کر دی اور ہم نو برس وہاں مقیم رہے ۔ اس کے بعد ایک سال بغداد شریف ، ایک سال نجف اشرف و کربلائے معلی میں بسر ہوا ۔ آخر اتنی مدت کے بعد دہلی کی یاد نے بے چین کیا اور روانہ ہو کر دہلی آ گئے ۔ یہاں انگریزوں کی سرکار نے بہت بڑا ترس کھا کر دس روپیہ ماہوار پینشن مقرر کر دی ۔ اس پینشن کی رقم کو سن کر اول تو مجھے ہنسی آئی کہ میرے باپ کا اتنا بڑا ملک لے کر دس روپے معاوضہ دیتے ہیں مگر پھر خیال آیا کہ ملک تو خدا کا ہے ۔ کسی کے باوا کا نہیں ۔ وہ جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے جس سے چاہتا ہے چھین لیتا ہے ۔ انسان کو دم مارنے کی مجال نہیں ہے ۔"

غلام عباس

(۱۹۰۹ء تا ۱۹۸۲ء)

گوندنی والا تکیہ

خدا خدا کر کے ریل کا طولانی سفر ختم ہوا اور میں[1] قلی سے اپنا سوٹ کیس اور بیگ اٹھوا ، مسافروں کے جمگھٹ سے نکلا اور اپنے قصبہ کے چھوٹے سے سٹیشن پر اتر پڑا ۔

میں ایک طویل مدت کے بعد اس خطۂ زمین پر دوبارہ قدم رکھ رہا تھا جو میرا آبائی وطن تھا ۔ مگر سفر کی تکان ، سردی اور بے خوابی کی وجہ سے دل و دماغ پر کچھ ایسا بوجھ تھا کہ نہ تو حب وطن نے میرے دل میں سوزوگداز کی کوئی کیفیت پیدا کی اور نہ وہ عرفانی مسرت ہی حاصل ہوئی جو وطن واپس آنے پر عموماً لوگوں کو ہوا کرتی ہے ۔ اس کے برعکس میں یہاں آ کر ایک اجنبیّت سی محسوس کرنے لگا تھا ۔ اور چاہتا تھا کہ جلد سے جلد منزل مقصود پر پہنچ جاؤں ۔

میں ابھی بچہ ہی تھا کہ والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اور جب والدہ نے انتقال کیا تو میری عمر تقریباً پندرہ برس کی تھی ۔ اس صدمے سے میں سخت دل برداشتہ ہو گیا تھا ۔ نہ کوئی بھائی تھا

---

۱ - یہ سبق غلام عباس کے ناول ''گوندنی والا تکیہ'' کا پہلا باب ہے ''میں'' سے مراد ناول کا ہیرو ہے جس کی زبانی تمام واقعات بیان کیے گئے ہیں ۔

نہ بہن - آٹھتی جوانی تھی ، دل میں امنگیں تھیں - سر میں آزادی کی دھن ایسی سمائی کہ ایک رات میں چپکے سے گھر سے نکل کھڑا ہوا اور جدھر منہ اٹھا چل دیا تھا -

سیاحت کے شوق اور معاش کی تلاش نے مجھ سے ملک ملک کی خاک چھنوائی تھی اور آخر کار میں سمندر پار ایک غیر ملک میں بس گیا تھا - میں نے کچھ دولت یا ثروت حاصل نہیں کی تھی - معمولی تجارت کا کاروبار تھا - مگر میں اس میں کچھ اس بری طرح پھنس گیا کہ نکلنا محال ہوگیا - اس پر میں نے شادی بھی وہیں ایک نیک بخت سے کر لی تھی - جس نے اور بھی پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں اور میں ہمیشہ کے لیے دیار غیر کا ہو کے رہ گیا تھا -

اب جب کوئی بیس برس کے بعد بعض اہم کاروباری امور کے سلسلے میں میرے لیے وطن کا چکر لگانا ناگزیر ہوگیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ کاروبار سے فارغ ہو کر واپسی پر اپنے اس جنم بھوم کو بھی ایک نظر دیکھتا چلوں گا - میرے اس ارادے کو اس وجہ سے اور بھی تقویت حاصل ہوئی کہ اس قصبے میں ہماری کچھ آبائی جائیداد تھی جس کی فروخت کی بات چیت ایک عرصے سے ہو رہی تھی - مگر چونکہ اس کے ورثا میں میں بھی شامل تھا - اس لیے میری عدم موجودگی میں اس کی تکمیل نہ ہو سکی تھی - لٰہذا اس سلسلے میں میرا اس قصبے میں آنا لازمی ہوگیا تھا -

اس بیس برس کے طویل عرصے میں جو میں نے باہر گزارا تھا ، قصبے کے سٹیشن میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی - البتہ سٹیشن سے باہر نکلتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نئی جگہ پہنچ گیا ہوں - قصبہ بہت پھیل گیا تھا - جو علاقے میری ہوش میں اجاڑ پڑے رہتے تھے - وہاں اب چھوٹے چھوٹے بازار بن گئے تھے - ہر طرف چہل پہل تھی - سٹیشن کے باہر جہاں کبھی اِکا بھی

مشکل سے ملا کرتا تھا وہاں اب تانگوں اور ٹیکسیوں کے الگ الگ اڈے موجود تھے ۔

مجھے دیکھتے ہی دو تین تانگے والے شور مچاتے ہوئے لپکے ۔ میں نے ایک کوچوان کو چن کر جو مجھے نسبتاً شریف صورت نظر آیا ۔ اس ہوٹل کا پتا بتایا جس میں ٹھہرنے کی مجھے وکیل نے ہدایت کی تھی اور اپنا مختصر سا سامان اس کے تانگے میں رکھ سوار ہوگیا ۔ جائیداد کے دوسرے ورثا کو جو میرے چچیرے بھائی اور بہنیں تھیں ، اگلے روز پہنچنا تھا ۔ میں ان سے ایک روز پہلے اس لیے آگیا تھا کہ اپنے جنم بھوم کو جی بھر کو دیکھ سکوں ۔

تانگا چلا تو میں نے اپنے گردو پیش کا جائزہ لینا شروع کیا ۔ جا بجا پختہ اینٹ کی بنی ہوئی عمارتیں نظر آئیں ۔ کچے گھروندے بھی دکھائی دیے مگر خال خال ۔ سٹیشن کے قریب ایک چھوٹا سا پارک بھی دیکھنے میں آیا ۔ جہاں لوگ دھوپ میں گھاس پر بیٹھے بڑے مگن معلوم ہوتے تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ میرے بعد اس قصبے نے بہت ترقی کر لی تھی ۔ اور مجھے اس پر خوشی ہونی چاہیے تھی مگر اس کو کیا کروں کہ میرے دل میں لمحہ بہ لمحہ بیگانگی کا احساس بڑھتا ہی جاتا تھا ۔ سٹیشن کے سوا مجھے اب تک کوئی جانی پہچانی شے نظر نہ آئی تھی ۔ کوئی ایسی چیز جس کو دیکھ کر بچپن کی کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہو جاتی ۔

تھوڑی دیر میں تانگا ہوٹل کے پاس پہنچ گیا جو ایک بازار کے نکڑ پر تھا ۔ یہ ہوٹل دیکھنے میں ایسا ہی تھا جیسے شہروں میں معمولی درجے کے ہوتے ہیں ۔ تانگے والے نے بتایا کہ آس پاس اور بھی کئی ہوٹل ہیں مگر سب میں اچھا یہی ہے ۔ قصبے میں ہوٹلوں کا کھل جانا بھی بلا شبہہ اس کی ترقی کی علامتوں میں سے ایک تھا ۔ وگرنہ میرے زمانے میں تو یہاں فقط ایک سرائے ہوا

کرتی تھی -

ہوٹل کا مینیجر یا مالک جو کوئی بھی وہ تھا ، مجھ سے بڑے تپاک سے ملا - اُس نے کہا :

" یہاں آپ کو اپنے شہر کا سا آرام تو نہیں مل سکے گا - البتہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو بلا تکلف فرما دیجیے گا ، ہم حتی الامکان مہیا کرنے کی کوشش کریں گے -"

وہ تھا تو ادھیڑ عمر مگر چاق و چوبند اور چرب زبان - اُس کے لہجے اور لباس سے قصباتی پن ظاہر نہیں ہوتا تھا - میں نے اس کا شکریہ ادا کیا - نہ جانے کیوں میں نے اُسے یہ بتانا مناسب نہیں سمجھا کہ میں اسی قصبے کا قدیمی باشندہ ہوں -

مجھے رہنے کے لیے جو کمرہ دیا گیا وہ خاصہ کشادہ اور صاف تھا اُس میں رنگین پایوں والا ایک بڑا سا نواڑی پلنگ بچھا تھا - ایک پرانی وضع کی گول میز اور دو کرسیاں تھیں - علاوہ ازیں ایک دیسی ساخت کا آئینہ ، دو تین قطعات چوکھٹوں میں جڑے ہوے ، بعض فلمی ستاروں کے رنگین فوٹو اور ایک پچھلے سال کا کیلنڈر جس پر چھاپے خانے کے معمر پروپرائٹر کی تصویر تھی ، دیواروں پر مختلف زاویوں سے لٹکے ہوے کمرے کی زینت بڑھا رہے تھے - میز پر پیتل کی ایک منقّش گول راکھ دانی بھی رکھی تھی - غرض مسافروں کے آرام کا حتی المقدور خیال رکھا گیا تھا -

میں نے اپنا سوٹ کیس اور بیگ کمرے میں ایک طرف رکھوا دیا - غسل خانے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا - دوپہر کے کھانے کا وقت نکل ہی چکا تھا ، اس لیے صرف چائے ، توش اور انڈے پر اکتفا کی - اس کے بعد بیگ سے اپنا مختصر سا بستر نکالا اور کمبل اوڑھ پلنگ پر دراز ہوگیا - ذرا سی دیر میں آنکھ لگ گئی -

کوئی دو گھنٹے کے بعد اُٹھا تو طبیعت بحال تھی۔ سفر کی تکان بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ شام ہونے میں ابھی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا۔ میں جلدی جلدی لباس تبدیل کر کے قصبے میں گھومنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

صبح سے اب تک نئی آبادی دیکھ دیکھ کر طبیعت بھر چکی تھی۔ چنانچہ اب میرے قدم کشاں کشاں مجھے اس علاقے کی طرف لیے جا رہے تھے جہاں میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ وہ علاقہ ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھا۔ البتہ نئے نئے بازار اور سڑکیں بن جانے سے مجھے دو چار جگہ راستہ معلوم کرنے میں دقت ہوئی۔ لیکن بالآخر میں نے خود کو اپنی اسی پرانی حویلی کے سامنے پایا جس میں میری نال گڑی تھی۔ یہ اور اس کے ساتھ والی حویلی دونوں قریب قریب ایک ہی نقشے کی تھیں جنھیں میرے جد امجد نے تعمیر کرایا تھا۔ اب جو جائیداد فروخت ہونے والی تھی وہ انھی حویلیوں پر مشتمل تھی۔ انھیں ایک مدت سے کرائے پر اُٹھا دیا گیا تھا۔ کیونکہ میرے بعد میرے اقربا نے بھی قصبے سے نکل شہروں کی سکونت اختیار کر لی تھی۔

دونوں حویلیوں کے در و دیوار سے شکست و ریخت کے آثار ہویدا تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی دیکھ بھال کی طرف خاصی بے توجہی برتی گئی ہے۔ ان حویلیوں کے سامنے گلی میں چار پانچ بچے قریب قریب ایک ہی عمر کے میلے کچیلے کپڑوں پر رنگ برنگے سویٹر پہنے ریٹھے کی گولیوں سے کھیل رہے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ایک بچے نے جس کی صورت سے بڑی معصومیت ٹپکتی تھی نہ جانے کس جذبے کے تحت اچانک ہنسنا شروع کر دیا۔ میں بھی بے اختیار مسکرا دیا۔ جی میں آیا کہ ان بچوں کو مٹھائی کے لیے کچھ پیسے دوں مگر پھر اس خیال سے کہ شاید

اُن کے ماں باپ کچھ شک کریں یا برا مان جائیں میں نے ہاتھ روک لیا اور جو بچہ ہنسا تھا اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کر میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آگے بڑھ گیا ۔

میں یہاں پل بھر ہی کو رکا تھا مگر اس ذرا سے وقفے میں میرا سارا بچپن میری آنکھوں میں پھر گیا تھا ۔ اس بچے کی معصوم ہنسی نے بیگانگی کے اس طلسم کو یک لخت توڑ دیا تھا جو دوپہر سے مجھ پر مسلّط تھا ۔ میرا دل شدت جذبات سے بھر آیا تھا ۔ جی چاہتا تھا کہ بار بار اس کوچے کا طواف کروں ۔ لیکن میں نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا ۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس محلے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی ۔ اور وہ قریب قریب ویسا ہی تھا جیسا کہ آج سے بیس برس قبل میں اسے چھوڑ گیا تھا ۔

ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر ایک کھلا میدان ہوا کرتا تھا۔ جہاں ہم لڑکے سکول سے آنے کے بعد کھیلا کرتے تھے ۔ اور یہیں وہ پرانا تکیہ بھی تھا جس کو "گوندنی والا تکیہ" کہتے تھے ۔ کیونکہ اس میں گوندنی کے آٹھ دس پیڑ تھے ۔ ہم لڑکپن میں ان درختوں کی چھاؤں میں کھیلا کرتے ۔ اور گوندنی کا موسم آتا تو پیڑوں پر چڑھ کے گوندنی توڑا کرتے ۔

تکیے کا سائیں ہمیں گوندنی توڑنے سے کبھی منع نہیں کرتا تھا ۔ البتہ جب کوئی لڑکا شاخ توڑ دیتا تو وہ ناراض ہو جاتا اور کبھی کبھی کان بھی اینٹھ دیتا ۔ اس کا یہ قاعدہ بھی تھا کہ ہم گوندنی توڑنے کے بعد اسے دکھا دیا کریں ۔ وہ ہم سے گوندنی لیتا نہیں تھا ۔ بس ایک نظر دیکھ لیا کرتا ۔ اگر اسے خبر ہو جاتی کہ کوئی لڑکا اسے دکھائے بغیر گوندنی لے گیا ہے تو وہ اس کا حلیہ یاد رکھتا ۔ اور پھر کبھی اسے گوندنی کے پیڑوں پر چڑھنے نہ دیتا ۔

کئی مرتبہ دکانداروں نے ان پیڑوں کے پھل کا ٹھیکہ لینے

کے لیے اُسے خاصی معقول رقم پیش کی مگر اُس نے کبھی منظور نہ کیا - وہ کہا کرتا - "یہ تو محلے کے بچوں کا مال ہے -"

یہاں سے میں نے سیدھا اُس تکیے کا رخ کیا - مگر وہاں نہ تو میدان کا پتا تھا نہ تکیے کا - ہر طرف پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے مکان نظر آ رہے تھے - میں نے خیال کیا شاید راستہ بھول گیا ہوں مگر پھر پھر کر ہر مرتبہ وہیں آ نکلتا تھا - جس جگہ تکیہ ہوا کرتا تھا وہاں اب ایک چار دیواری کھینچ دی گئی تھی - میں نے اُس کے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک مدرسے کے سے آثار دکھائی دیے - ایک لڑکا باہر نکل رہا تھا - میں نے اُس سے پوچھا :

"میاں صاحبزادے ! یہاں گوندنی والا تکیہ ہوا کرتا تھا وہ کیا ہوا ؟"

لڑکے نے جس کی عمر کوئی دس گیارہ برس کی ہوگی جواب دیا :

"کونسا تکیہ ؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھا -"

"تم اسی محلے میں رہتے ہو ؟"

"جی ہاں - وہ سامنے اونچے بخارچے والا ہمارا ہی مکان ہے -"

اتنے میں ایک معمر شخص پاس سے گزرے - میں نے انھیں سلام کیا اور پوچھا :

"حضرت ! یہاں جو گوندنی والا تکیہ ہوا کرتا تھا وہ کیا ہوا ؟"

اُن بزرگ نے مجھ پر سر سے پیر تک ایک نظر ڈالی - پھر فرمایا :

"آپ شاید مدت کے بعد یہاں تشریف لائے ہیں ؟"

"بجا فرمایا جناب نے - کوئی بیس برس بعد -"

"جبھی تو - صاحب وہ تکیہ اُٹھوا دیا گیا تھا -"

"یہ کیوں ؟ اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو ذرا اس کی تفصیل سے آگاہ کیجیے ۔ ممنون ہوں گا ۔"

ایک ذرا تأمّل کے بعد وہ یوں گویا ہوے :

"پندرہ یا شاید سولہ برس ہونے کو آئے کہ اس تکیے کے متولّی کا انتقال ہو گیا ۔ بھلا سا نام تھا اُس کا ۔"

"نگینہ سائیں ۔" میں نے کہا ۔

"ہاں ہاں یہی نام تھا ۔ وہ خود تو نیک دل اور بہت اچھی طبیعت کا تھا ۔ مگر اُس کے مرنے کے بعد جو لوگ اس تکیے پر قابض ہوے ، ان کا کردار اچھا نہیں تھا ۔ دن رات چرس کے دم لگنے لگے ۔ بھنگ گھوٹی جانے لگی ۔ اور یہ تکیہ اچھا خاصا اوباشی کا اڈا بن گیا ۔ بازاری عورتیں کھلم کھلا یہاں آنے لگیں ۔ آخر کار قصبے والوں نے آپس میں مشورہ کر کے اس تکیے کو مسمار کر کے اس کی جگہ ایک مدرسہ قائم کر دیا ۔"

"اس تکیے میں کسی بزرگ کا مزار بھی تو ہوا کرتا تھا ؟" میں نے پوچھا ۔

"جی ہاں مستان شاہ کا ۔ وہ مزار اب بھی مدرسے کے صحن میں موجود ہے ۔ مگر کسی مجاور کو یہاں رہنے کی اجازت نہیں ۔ مدرسے کے معلم خود ہی اس کی دیکھ بھال کر لیتے ہیں ۔"

"گوندنی کے درخت تو کٹوا ہی دیے گئے ہوں گے ؟"

"بس ایک رہنے دیا گیا ہے جو مستان شاہ کی قبر پر سایہ کیے ہوے ہے ۔"

میں یہ سن کر دنگ رہ گیا ۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے ۔ اس کے بعد میں نے اُن بزرگ کا خلوص دل سے شکریہ ادا کیا ۔ اور مدرسے کے اندر داخل ہو گیا ۔

مدرسے کے صحن میں پختہ اینٹ کا فرش تھا۔ اُس کے ایک گوشے میں گوندنی کے ایک پیڑ کے نیچے ایک قبر نظر آئی جو سبز رنگ کی ایک بوسیدہ سی چادر سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اُس پر کچھ سوکھے ہوئے پھول پڑے تھے۔ میں نے قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی۔ پھر چپ چاپ واپس ہوٹل کی طرف چل دیا۔

اپنے کمرے میں پہنچا تو حد درجے کی افسردگی مجھ پر طاری تھی۔ اس تکیے کے اُٹھ جانے کا مجھے بڑا قلق ہوا تھا۔ مگر میں قصبے والوں کو الزام نہیں دیتا۔ شاید وہ اُس زمانے کے حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے اپنے فیصلے میں حق بجانب ہوں۔ ممکن ہے میں اس زمانے میں یہاں ہوتا تو اُنہی کا ساتھ دیتا۔ مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ تکیہ غریب غربا کا مونس اور سارے قصبے کی تفریح گاہ تھا جس سے وہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے گئے۔

وہ علی الصّباح تکیے سے بھیروں کے میٹھے سروں میں "اللہ ہو اللہ جَلَّ شان اللہ" کی الاپ کا بلند ہونا، وہ حال وقال کی محفلیں، وہ پنجابی کے مشاعرے، وہ بٹیروں کی پالیاں، وہ گویّوں کے مقابلے، وہ گوندنی کی شاخوں میں لٹکے ہوئے تیتروں کا "سبحان تیری قدرت" چہکارنا، کسی پیڑ کی چھاؤں میں کوئی نو مشق ستار پر گت بجا رہا ہے، کہیں چوپڑ کھیلی جا رہی ہے، کہیں ہیر پڑھی جا رہی ہے اور سننے والے دم بخود بیٹھے ہیں۔ پاس ہی بچے کانچ اور ریٹھے کی گولیوں سے کھیل رہے ہیں۔ کبھی کبھی اُن کے لڑنے جھگڑنے اور شور مچانے پر بڑوں میں سے کوئی اُٹھتا ہے اور دو ایک کے چپت لگا جاتا ہے۔ اور بچے پھر کھیلنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اور پھر اس تکیے کی جان اُس کا بلند بالا نگینہ سائیں، گلے میں رنگ برنگ منکوں کی مالا ڈالے، سردی گرمی اپنی ایک ہی

پرانی کالی کملی میں اپنے نیم برہنہ جسم کو چھپائے ، کبھی دیوانہ ، کبھی فرزانہ مگر ہر حال میں کہ وہ مہ کی خدمت کے لیے مستعد۔

شام ہو چکی تھی - کمرے میں خاصی خنکی تھی - مگر میں نے بجلی کا بلب روشن نہیں کیا تھا - کیونکہ کمرے کی نیم تاریکی سکون بخش تھی - میں کمبل اوڑھ کر آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا - گوندنی والا تکیہ اپنی پوری گہما گہمیوں کے ساتھ میری نظروں میں پھرنے لگا - - - -

---

احمد ندیم قاسمی

(ولادت : ۱۹۱۶ء)

سفارش

محلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا ۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا ۔ اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا ۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے ۔ اچانک میں نے فیکے کوچوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا " بھئی فیکے تانگا کہاں ہے ؟ تانگا لاؤنا ۔"

"تانگا تو بابو جی ، آج نہیں جوڑا ہے"۔ فیکے نے جواب دیا ۔

میں نے دیکھا کہ فیکا جو کوچوان کا کوچوان اور پہلوان کا پہلوان تھا ۔ اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا ۔ اس کی آنکھیں بھی سرمے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں ۔

" کیا بات ہے فیکے ؟" میں نے پوچھا ۔

وہ بولا : "بابوجی ایک کام ہے"

" ہاں ہاں کہو" میں نے کہا :

" کام یہ ہے بابوجی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا ؟"

فیکا بولا ۔ "اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے"

" او ہو : مجھے دکھ ہوا ۔ کیسے گئی ؟ کیا کوئی حادثہ ہوا ؟ "

" جی نہیں فیکے کے چہرے پر بھول پن کا چھینٹا پڑ گیا ۔

" لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا ۔ آپ تو جانتے ہیں آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں ۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا ۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی ۔ حکیم نے خدا رسُول کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا ۔ میں نے بھی کہ دیا کہ حکیم خدا رسُول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لگا لے ۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی ۔ اس نے " لقمان حکیم ۔ حکمت کا بادشاہ " پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی ۔ بس پھر کیا تھا بابو جی قسم کھا کر کہتا ہوں ۔ جب سے اب تک آنکھ لگی ہو تو اپنے باپ کا نہیں ۔ بابو جی ، آپ تھک تو نہیں گئے ؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھا لاؤں ؟ "

اس وقت فیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے ۔ میں نے کہا : "تم بھی حد کرتے ہو فیکے ۔ اب آگے بھی کہو نا ۔"

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی ۔ وہ بولا ۔ " بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے رات تو چیخ چاخ کے گزار دی پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چچا شیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں اُبالو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا ۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ اُبال کر باندھو ، باندھا اور جب کھولا

تو بابا نے صاف کہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا ۔ ہمارے گھر میں تو پٹس پڑ گئی بابو جی ۔ اسے ایک ہسپتال میں لے گئے ، پھر دوسرے میں لے گئے ۔ دونوں میں جگہ نہ تھی ۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالا میو ہسپتال میں چوکیدار ہے ۔ اس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برانڈے میں ۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں ۔ پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی ادھر نہیں آئی ۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھیے ہاتھ باندھتا ہوں ۔ میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہ دیجیے کہ صدیقے مریض کو ذرا سا دیکھ لے ۔"

میں نے کہا ."وہاں ایک ڈاکٹر ہے ، ڈاکٹر عبدالجبار ۔ ان سے میرا سلام کہو ۔ کام ہو جائے گا ، نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا ۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے ، نام یاد کر لو ڈاکٹر عبدالجبار" ؟

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا ۔ پھر مجھے ایک خالی تانگا مل گیا ۔ جب تانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ہسپتال کے ایک چوکیدار سے باتیں کر رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتا پوچھ رہا ہوگا ۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہ دوں مگر اب تانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہوگئی تھی ۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا اور دس منٹ تک گرا رہا ۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو یکا یک جبار صاحب کا سکوٹر میرے تانگے کے قریب سے زنن سے گزر گیا ۔ جبار صاحب ! میں چلاّیا ۔ مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے ۔

کوئی بات نہیں ، میں نے سوچا ، کل کہ دوں گا ۔ کل پہلا کام ہی یہی کروں گا ۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلا لیں ۔

میں نے سوچا ، اس وقت کون بلائے ۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکریہ صبح قبول کر لوں گا ، اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہو گی صبح ہی کو ہو گی ۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے ۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے ۔

" یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا ؟ " میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی ۔

"جی ہاں ،" وہ بولا "مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی ۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا ۔ دس سال سے چھپر میں پڑے ہیں ۔"

" اور اس کی آنکھ ؟ " میں نے پوچھا ۔

" وہ تو چلی گئی بابو جی ۔" فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں ۔

میں نے کہا : "جب آنکھ جا ہی چکی ہے تو بے چارے بڈھے کو ہسپتالوں میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو ؟ وقت بھی ضائع ہو گا روپیہ بھی ضائع ہو گا ۔"

فیکا بولا : " بابو جی کیا پتا آنکھ کے کسی کونے کھدرے میں بینائی کا بھورا پڑا رہ گیا ہو ۔ دیکھیے چولھا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے ۔ کیا پتا کوئی چنگاری سلگ رہی ہو ۔"

میں اس بات سے چونکا - آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں - پھر وہ عاجزی سے بولا - "بابو جی ، ذرا سا میرے ساتھ چلے چلیے -"

میرے جسم میں نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی - پھر نہانا تھا - شیو کرنا تھا چائے پینی تھی - میں نے کہا - "میں تمھیں اپنا کارڈ دے دیتا ہوں - وہ ڈاکٹر جبار کو دکھا دو - بڑے یار آدمی ہیں - فٹا فٹ کام کر دیں گے - تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے - پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا -"

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہے - میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا - جبار صاحب ! اس کا کام کر دیجیے ، بے چارا بڑا ہی غریب آدمی ہے دعائیں دے گا اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا - ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رمق باقی ہے -

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹتا رہا - شام کو اس نے مجھے بتایا کہ "جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا - کہتے ہیں باری سے آؤ اور میری باری آتی ہی نہیں - گھٹنا پاجامے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی -"

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا - نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حساس فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا -

میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا - اب تو شام ہو گئی ہے -

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخو پورے جانا پڑ گیا - رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا -

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا ۔ مگر فیکا نہ آیا ۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا ۔ تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے ۔ اتنے میں فیکا بھی آ نکلا ۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی اس لیے جھوٹ بولنا پڑا ۔ "کیوں فیکے ، جبار صاحب نے کام کر دیا نا ؟ "

وہ بولا ۔ " مگر بابو جی ، وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں ۔"

میں نے فوراً کہا ۔ " میں نے اُنھیں فون کر دیا تھا ۔"

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہوگیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اُٹھی ۔" جبھی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہ رہی ہے ، کہ دیکھو ، بڈھے کو تکلیف نہ ہو ۔"

پھر میں وہاں سے چلا آیا ۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اُٹھ رہے تھے ۔ مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگ جا رہا تھا ۔ رات کو نیند نے ندامت دور کر دی ۔ مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا ۔ بولا "آپ کی مہربانی سے داخلہ تو مل گیا تھا پر اب اُنھوں نے بابا کو کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے ۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی ۔ آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا ۔ دو روپے گل ہوگئے ۔ کچھ ہو سکے تو کیجیے ۔"

میں نے کہا ۔ "میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں ۔"

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے ۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہوگئی ۔ پانچ چھے روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں چرا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں ۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا ۔" بابو جی ، سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا

بدلہ اتاروں گا۔"

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ "واپس آ گیا نا تمہارا بابا۔؟"

فیکا بولا۔ "واپس بھی آ گیا اور اپریشن بھی ہوگیا۔ جمعہ کو پٹی کھل رہی ہے۔ دعا کیجیے۔"

میں نے کہا۔ "اللہ رحم کرے گا۔"

پھر وہ جمعہ کی شام کو آیا۔ تو بولتے ہی زار زار رونے لگا۔ "بابو جی غضب ہوگیا پٹی کھلی تو پتا چلا۔ ایک آنکھ تو گئی ہی تھی، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم ملے تو دوسرا اپریشن ہوگا۔ اور دوسری آنکھ کا بھی ہوگا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا۔ مگر بدقسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوے تو انھیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جا تو نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔

ادھر فیکا بھی غائب ہوگیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکر نے آ کر بتایا کہ فیکا کوچوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلدی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ "کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟"

"جی ہاں۔" نوکر بولا۔ "بس میرے منہ سے نکل گیا۔"

"بڑے احمق آدمی ہو -" میں نے اسے ڈانٹا اور کہا - "جاؤ کہ دو کپڑے بدل رہے ہیں - آتے ہیں -"

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا - پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لاکھ کی بھی بات نہیں - دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں - مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا - پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے سچی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دکھ بھی نہ ہو -

میں باہر آیا تو فیکا بولتے ہی زار زار رونے لگا - بابو جی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا - - - - - -" اس کی آواز بھرا گئی -

میرے سوچے ہوے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے بمشکل میں نے کہا - "فیکے بات یہ ہے فیکے کہ — بات یہ ہے —"

آنسوؤں سے بھیگا ہوا، بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرہ لیے فیکا اٹھا، اور بولا "بابو جی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا - میں شکریہ ادا کروں تو کیسے کروں - میرا بابا ٹھیک ہو گیا ہے - اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں - اسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے - آپ نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی - قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا -"

اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا - "کوئی بات نہیں فیکے - کوئی بات نہیں -"

انتظار حسین

(ولادت : ۱۹۲۵ء)

فراموش

سڑک سے ذرا ہٹ کر اونچے اونچے دودھیا کھمبے ، سیمنٹ کا اجلا چبوترہ اور وہ حوض جس میں شفاف چمکیلا پانی ایک متوازن رفتار اور آواز کے ساتھ نالیوں کے ذریعہ بہتا اور نکلتا رہتا ، وہ مقفل ، کوٹھری جس پر سرخ لفظوں میں لکھا ہوا تھا "خطرہ" ہے اور ان سب سے ہٹ کر بیس تیس قدم پرے ایک سبک ، سفید مختصر سی کوٹھی جیسے کبوتری نے ابھی ابھی انڈا دیا ہو - ان سب سے مل جل کر کچھ ایک ہی قسم کی فضا پیدا ہوتی تھی یا وہ سب مل جل کر ایک ہی قسم کی فضا سے پیدا ہوئی تھیں - نرم نرم اجلی اجلی فضا ، لیکن سڑک نہ تو یہاں سے شروع ہوتی تھی اور نہ یہاں ختم ہوتی تھی - اپنے محلے کی گلیاں طے ہو چکتیں تو آبادی ختم ہوتی نظر آتی اور وہ سڑک شروع ہو جاتی جو آبادی سے باہر بھی تھی - اور آبادی کی نشانیاں بھی رکھتی تھی کچے میں اتر کر کسی نیچے نیم سے ایک ٹہنی توڑ کر مسواک بنانا اور دانتوں سے چباتے ہوئے پھر اسی لمبی سڑک پر ہو لینا - چونگی کی چوکی جہاں کبھی میلے اجلے زرد خربوزے ، کبھی ہری ہری ککڑیوں کی چھابڑی ، کبھی

گھیرے ہرے کریلوں سے لدے گدھے کھڑے نظر آتے۔ پھر وہ روں روں کرتا ہوا رہٹ جس کا اونٹ اردگرد سے بے خبر اسی بے کیف سے انداز میں چکر کاٹتا رہتا پھر ٹیوب ویل کا سیمنٹ والا حوض اور وہ کھمبے اور وہ کوٹھی۔ کوٹھی سے آگے بہت دور تک دونوں طرف کھلا میدان جہاں کہیں کہیں بہت دور بہت سی بھینسیں جیسے خواب میں ہوں چلتی اور چرتی نظر آتیں۔ اور اس کے بعد اچانک سڑک موڑ کھاتی اور مشن سکول کی سرخ عمارت سامنے آ جاتی اور اس سے خاصی دور بھٹے کی خاموش کالی چمنیاں دکھائی دیتیں جو قریب آتی جاتیں اور پھر سامنے سے پیچھے کی طرف ہوتی جاتیں۔ اور اس کے بعد ایکا ایکی ریل کی پٹڑی سڑک کو کاٹ جاتی۔ یہ اپنی آخری حد تھی۔ لوہے کا وہ سفید کٹھرا کھلا ہو یا بند میں نے کبھی پٹڑی کو عبور کرنے کی خواہش ہی محسوس نہیں کی فوراً پلٹ پڑتا۔ نیم کے کڑوے سفید ریشوں سے دانتوں کو ملتا دَلتا، آموں کے گھنے درختوں کے نیچے سے ہوتا ہوا کہ شاید کوئی کچی امبیا ہاتھ پڑ جائے۔ بھٹے کی چپ چاپ چمنیوں اور مشن سکول کی سرخ عمارت، خواب میں چلتی اور چرتی ہوئی بھینسوں کی معین نشانیوں سے گزرتا ہوا سیمنٹ والے حوض پر پہنچ کر دم لیتا۔ دانت صاف کر کے کلی کرتا، منہ ہاتھ دھوتا اور چپل اتار مٹی میں اٹے ہوئے پیر ٹھنڈے ٹھنڈے پانی میں ڈال دیتا تو عجیب فرحت ہوتی۔

فرحت اور آسودگی تو اس فضا میں رچی ہوئی تھی۔ جانے دن بھر یہی عالم رہتا تھا یا یہ فضا اس وقت سے مخصوص تھی۔ کبھی رات کو بہت حبس ہوتا تو بے شک اس وقت کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ لڑکے حوض میں چھلانگیں لگاتے پانی اڑاتے دکھائی دیتے تھے۔ ویسے تو خاموشی ہی رہتی تھی۔ بس سیمنٹ کی نالیوں میں رکتا بہتا اجلا پانی بچوں کی مدھم کلکاریوں جیسا شور پیدا کرتا رہتا یا کبھی کبھی کوٹھی کے سامنے سے گزرتے ہوئے ربڑ کی ایک سفید

گیند گدے کھانے لگتی ۔ میں ٹھٹک جاتا ۔ اس خاموش فضا میں یہ ننھی سی بات بھی ایک شور ایک واقعہ بن جاتی ۔ کم از کم ایک دفعہ کو تو میں چونک ہی پڑتا ۔ گیند کے پیچھے پیچھے ایک جوان سا لڑکا کہ حلیے سے نوکر لگتا تھا دوڑتا آتا اور بغیر کسی طرف دھیان دیے گیند اٹھا کر اسی یکسوئی سے واپس دوڑتا اور کوٹھی میں داخل ہو کر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ۔ کبھی کبھی کے اس واقعے ہی سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کوٹھی غیر آباد نہیں ہے اور انجینئر صاحب کے نام کی جو تختی دروازے پر آویزاں ہے ۔ وہ معنی اور مطلب رکھتی ہے ۔ سامنے سڑک پر گدے کھاتی گیند کو دیکھ کر کبھی تو میں یوں چونکتا کہ اس سفید ہلکی پھلکی کوٹھی کا کوئی حصہ اچھل کر سڑک پر آ پڑا ہے ۔ کھلی فضا میں گول گول خطوں اور خموں والی سفید عمارت ۔ سچ مچ یوں لگتا کہ ربڑ کی بہت سی گیندوں کو اوپر تلے رکھ کر کوٹھی بنائی گئی ہے ۔

پھر ایک اور واقعہ ہوا ننھا مگر نیا ، کوٹھی کے عین سامنے سڑک پر چلتے ہوئے میرے قدم رک گئے جیسے ایک ساتھ سامنے دیوار آ گئی ہو ۔ یا جیسے سامنے ریل کی پٹری رستہ کاٹ رہی ہو ۔ اور چوکیداروں نے اچانک کٹھرا بند کر دیا ہو ، لیکن کالی سڑک پر سفید چاک سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھا ہوا تھا : "فراموش" اگرچہ پھر میں چل پڑا لیکن ایک مرتبہ تو ٹھٹک ہی گیا اور وسوسے میں پڑ گیا کہ اس رستہ کاٹتی لکیر کو پھلانگوں یا نہ پھلانگوں ، فراموش کے لفظ سے باتیں اور یادیں بھی تو وابستہ ہیں ۔ شاید ان کا یہ کرشمہ ہو ۔ آموں کے موسم میں یہ لفظ میرے بچپن میں اچھے خاصے ایک دھاکے کا کام کرتا تھا ۔ کسی نے بے خبری میں دوگاڑا[1] آم تھما دیا اور کہہ دیا "فراموش" اور ہاتھوں میں ایک زنجیر سی بندھ گئی یا جیسے اچانک کسی نے سارا جسم رسی سے

---

[1] ۔ دوگاڑا بمعنی دہریا ۔ جڑواں ۔

کس دیا ہو ۔ چینی کی پلیٹ پر بڑے تکلُّف سے سرپوش ڈھکا ہوا ۔ خیال ہوتا کہ کوئی تقریب ہوئی ہے اور کوئی بہت بڑھیا لذید شے اس تقریب سے بھیجی گئی ہے اور اتنے میں ہاتھ سرپوش کی طرف بڑھتا اور اچانک ایک للکار "فراموش" جیسے کسی نے جادو کی چھڑی چھوا دی ہو یا کوئی دعا پڑھ کے چھو کر دی ہو یا کنکریاں پڑھ کر مار دی ہوں ہاتھ دو گاڑا آم پر جا رہ جاتا ۔ دو سو آم نذر کیجیے اور اس قید بے زنجیر سے اس جکڑی ہوئی رسی سے جان چھڑائیے ۔

دوسرے دن جب میں پھر وہاں سے گذرا تو وہ لکیر باق تھی اگرچہ ادھ مٹی سی ہو گئی تھی ۔ اس سے مجھ پر کھلا کہ اپنے خاص وقت پر موقوف نہیں ۔ سارے ہی دن اس سڑک پر آمد و رفت کا سلسلہ برائے نام ہی رہتا ہے ۔

چھے "حرفی" ادھ مٹی لکیر مٹی میں اٹتی گئی ۔ مٹتے مٹتے بالکل ہی مٹ گئی بات آئی گئی ہوئی ۔ اپنا ورد اسی طرح جاری رہا سڑک کے موڑ سے گذر کر مشن سکول کی سرخ عمارت سے پرے بھٹے کی خاموش کالی چمنیوں سے ادھر ریل کی پٹڑی کو چھونا اور چھو کر پلٹنا اور سیمنٹ والے حوض میں مٹی میں اٹے ہوئے پیر ڈالنا ، منہ ہاتھ دھونا اور واپس گھر کو ہو لینا ۔

فراموش ۔ ۔ ۔ اپنے ورد میں ایک گرہ پھر پڑی لیکن اتنی ہلکی کہ نہ تو زمین نے قدم پکڑے اور نہ یہ کرید ہوئی کہ سفید انڈا سی دیوار کو کس نے کوئلے سے کالا کیا ہے ۔ وہی کچا کچا خط ٹیڑھے میڑھے خم اور دائرے ، الٹا ایک اطمینان سا ہوگیا کہ کسی راہ چلتے نٹ کھٹ لڑکے کی شرارت نہیں تھی ۔ یہیں کہیں کوئی بچہ رہتا ہے ۔ شاید اسی کوٹھی کا گیند کھیلنے والا بچہ ہو جسے موسم کے بہانے اس لفظ کا چسکا پڑا ہے ۔

واپسی میں میں نے دیکھا کہ ایک شخص کہ اس کی پیٹھ میری طرف تھی اور شب خوابی کے لباس اور ادھیڑ عمری کے باوصف تیور سے افسری کی چغلی کھاتا تھا ، ہاتھ میں چھڑی لیے دیوار کی طرف اشارہ کرتا ہے - اور مالی سرنیہوڑائے دیوار یوں صاف کر رہا ہے جیسے اس میں ساری خطا اسی کی ہے -

دوسرے تیسرے دن کا ذکر ہے کہ اسی مقام پر اسی خط میں وہ لفظ پھر لکھا نظر آیا اور میرے واپس ہوتے ہوتے وہ پھر صاف کر دیا گیا تھا - اس کے بعد ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ میں نے جاتے ہوے وہ لفظ لکھا دیکھا اور واپسی میں وہ مٹایا جا چکا ہوتا یا مٹایا جا رہا ہوتا -

ان ہی دنوں باہر جانا نکل آیا ، باہر جانا تو ہوتا ہی رہتا تھا - کبھی محصول وصول کرنے گاؤں کو ، کبھی مقدمے کے چکر میں شہر کو ، آج تھانے میں کھڑے ہیں تو کل تحصیل میں اور پرسوں ضلع کچہری میں - زیادہ سے زیادہ تین چار دن کسی اہلکار نے بہت ستایا تو ہفتہ عشرہ ہوگیا پراب کےتو پورے پندرہ دن لگ گئے یہ الگ بات ہے کہ اتنے دن کی واپسی پر بھی موسم ویسا ہی تھا -

دوسرے دن جب میں نے اپنا ورد شروع کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لفظ اسی مقام پر اسی خط میں پھر لکھا ہوا ہے - مگر حیرانی کی اب کونسی بات رہ گئی تھی - بلکہ اب تو اس لفظ کے مٹنے اور نقش ہونے کی تکرار بھی اپنے ورد کا جزو بن چکی تھی - ہاں حیرانی اس پر ہوئی کہ آج انجینئر صاحب اور انجینئر صاحب کے ملازم دونوں کی نگاہ چوک گئی - مگر حد ہوگئی کہ دوسرے دن بھی وہ لفظ اسی خط میں اسی مقام پر اسی طرح لکھا ہوا تھا - اب ماتھا ٹھنکا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے - سو سو طرح کا شک پڑا کہ انجینئر صاحب کیا لمبے دورے پر نکل گئے - کہیں تبادلہ تو

نہیں ہوگیا کیا خبر ہے کہ بیمار پڑے ہوں ، گمانوں کی ڈوری لمبی ہوتی گئی مگر گتھی گتھی ہوئی رہی -

برسات اب کی بار دیر سے لگی - تپتی دوپہروں کا سلسلہ ٹوٹنے ہی میں نہ آتا تھا دن کو اور رات کو حبس اور آندھی کا کوئی وقت مقرر نہ تھا - کبھی دن ڈھلنے سے پہلے اندھیرا ہو جاتا اور کبھی رات کی اندھیری میں اندھیاری[1] چلنے لگتی ، کوٹھوں اور منڈیروں پر کتنی مٹی اٹ گئی تھی اس کا اندازہ تو پہلا چھینٹا پڑنے پر ہوا - ایک روز صبح ہی صبح آنکھ کھلی تو ہر چیز دھلی دھلی اور ٹھنڈی ٹھنڈی نظر آئی - جس نیم سے روزانہ ٹہنی توڑ کر مسواک بناتا تھا وہ نہا دھو کر کتنا ہرا بھرا ہو گیا تھا - درخت اور کھمبے اور دیواریں سب ہی میں ایک شادابی دوڑ رہی تھی - ہاں سیمنٹ والے حوض میں آج پانی نہیں چل رہا تھا - بس بارش کا مٹیالا پانی رکا کھڑا تھا ، انجینئر صاحب کی کوٹھی بھی جو لوؤں اور آندھیوں کی گرد سے زرد پڑ چلی تھی پھر سفید انڈا سی نظر آنے لگی اور وہ لفظ کالے کوئلے سے لکھے ہوئے حرف دھل کر روشن روشن ہو گئے تھے -

برسات کیا لگی کہ مینہ کی جھڑی لگ گئی دن بارش رات بارش سوکھے تالاب موںہا منہ بھر گئے ، خستہ چھجوں کی لکڑی بھیگ بھیگ کر کالی پڑ گئی اور گلنے لگی اور اس میں سے سفید سفید سانپ کی چھتریاں ابھرنے لگیں لُباس[2] کی ننھی ننھی پتیاں پھیلتی گئیں چوڑی ہوتی گئیں - پتھریلی منڈیروں پر سبز و سیاہ کائی اور لکڑی کے گیلے کواڑوں پر پھپھوندی جمنے لگی - انجینئر صاحب کی کوٹھی پر بوسیدگی کے ایسے آثار نمایاں نہیں تھے ہاں وہ لفظ دھندلاتا جا رہا تھا - خموں کی پھیلی ہوئی سیاہی کو دیکھ کر لگتا تھا کہ

---

۱ - اندھیاری بمعنی آندھی (ہندی)

۲ - چھوٹی چھوٹی پتیوں والی ایک بیل

رسی کے بل کھل رہے ہیں ف کا نقشہ تو بالکل ہی مٹ گیا - ش کے تین نقطے ہلکے پڑتے گئے، پھیلتے گئے اور مدھم ہو کر ایسے بن گئے جیسے پتلی پتھرا رہی ہو - مجھے فکر ہوئی، کہیں یہ لفظ بالکل ہی نہ مٹ جائے۔

دراصل اپنا اس لفظ سے ایک رابطہ سا قائم ہو گیا تھا - اس سڑک کا یوں تو کسی چیز سے اپنا رابطہ نہیں لیکن بعض خاص خاص چیزیں اپنے لیے نشانیوں کا بلکہ سنگ میل کا مرتبہ رکھتی ہیں - اپنے اس روزانہ کے چھوٹے سے سفر کی نوعیت خالصتاً نجی ہے - منزل ہی نہیں میل اور سنگ میل بھی اپنے مقرر کیے ہوئے ہیں - چنگی کی چوکی، رہٹ، مشن سکول کی سرخ عمارت بھٹے کی خاموش چمنیاں یہ سنگ میل ہی تو تھے اب یہ لفظ بھی ایک سنگ میل بن گیا تھا - اس سنگ میل کو چھوتے ہی لگتا تھا کہ باقی میل یوں طے ہوئے - اور ریل کی پٹڑی اب آئی - کبھی کبھی یہ سنگ میل منزل بن جاتا - گویا اسے چھونے ہی گھر سے نکلے تھے اور اگر ریل کی پٹڑی تک جا رہے ہیں تو محض وضع داری کی خاطر برسات ڈھلنے لگی - مینہ کا زور ٹوٹ چلا، گھٹا ایسی گھر کے آئی جیسے ٹوٹ کے پانی پڑے گا - مگر دم بھر پانی پڑتا اور آن کی آن میں مطلع صاف بڑی بڑی سلونی جامنوں کی جگہ چھوٹی چھوٹی بد رنگ جامنیں آئیں پھر چھوٹی جامنیں بھی غائب ہونے لگیں جولائی کے پتے ہرے سے سرخ اور سرخ سے پیلے ہوئے، سانپ کی چھتریاں جس تیزی سے پھولی تھیں اسی تیزی سے مرجھائیں، طوطوں کے بچے نیم کی کھکھلوں سے نکل کر شاخوں پر آ گئے تھے اور ٹہنی ٹہنی پھدکتے پھرتے تھے - مونہا منہ تالاب گھٹتے گئے گھٹتے گئے، یہاں تک کہ پانی بھینسوں کے گھٹنوں تک رہ گیا - گری ہوئی چھتوں، جھکی ہوئی کڑیوں، چھجوں اور چونا اترتی دیواروں کی مرمت شروع ہو گئی تھی - اور احاطوں میں سے ڈھئی دیواروں کا ملبا اٹھنے لگا تھا انجینئر

صاحب کی کوٹھی کے احاطے میں چونے کی بوری رکھی نظر آئی تو کچھ عجیب سا احساس ہوا سفید بد رنگ دیواروں کا جائزہ لیتے ہوئے نظریں اپنے ٹھکانے پر جا کر ٹک گئیں۔ ف کا نقطہ پہلے ہی معدوم ہو چکا تھا۔ اب میم کی گھنٹی بھی گھل چلی تھی، شین کی پتلی کچھ اور پتھرا گئی تھی رسی کے بل کھل رہے تھے۔ بکھر رہے تھے۔ مگر اب تو کوچی کے ایک اشارے پر یہ پورا کا پورا چھ حرفی افسانہ حرف غلط بن جائے گا۔ اس خیال سے جی اک ذرا اداس ہوگیا۔ پہلی مرتبہ احساس ہوا یہ لفظ سنگ میل نہیں رستے کا ساتھی تھا جو اپنی جگہ پہ کھڑا دور سے اشارہ کرتا رہتا تھا اور دور تک اشارہ دیتا رہتا تھا۔

چونے کی بوری احاطے میں ڈیڑھ دو دن جوں کی توں رکھی رہی پھر بڑے بڑے دو ڈھول رکھے نظر آئے جن میں قلعی گھل رہی تھی اور دو تین کوچیاں اور ایک سیڑھی، دوسرے دن کوٹھی کو میں نے ادھ پُتی حالت میں دیکھا اندر کے بڑے حصے میں قلعی ہو چکی تھی مگر باہر کی دیواروں کو ابھی نہیں چھوا گیا تھا دوسرے دن دیکھا کہ ساری کوٹھی پر سفیدی ہو گئی ہے۔۔۔ مگر میں دنگ رہ گیا۔ باہر کی دیوار پر اس اہتمام سے سفیدی کی گئی تھی کہ فراموش، اپنی جگہ پر قائم تھا اور اس سلیقے سے کہ چونے کی ایک بوند کسی حرف پر نہیں پڑی تھی میں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ اور گویا ایک رسی نے میرے ہاتھ پیروں کو اس طرح جکڑ لیا کہ میں نہ آگے بڑھ سکتا تھا نہ پیچھے ہٹ سکتا تھا۔

اس کے بعد ہی میں اپنے دورے پر نکل گیا۔ اب کے دورہ لمبا تھا۔ واپس آیا اور اس کوٹھی کے برابر سے نکلا تو دیکھا کہ برآمدے میں تین چار بچے بے طرح دھما چوکڑی مچا رہے ہیں۔ اندر کے کمرے سے اس کے خلاف نسوانی احتجاج کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پھر ایک مردانہ ڈانٹ۔ مجھے بڑا اچنبھا ہوا، بچے

بڑے ، عورتیں مہین اور موٹی ، نرم اور رسیلی اور درشت آوازوں کے رنگ برنگے تار کہ ایک جان بن کر پھیل رہے تھے - آخر یہ نئی زندگی اچانک کیسے اور کہاں سے پھوٹ پڑی - خاموش برآمدوں ، اور احاطوں ، شیشے والے بند دروازوں اور گنگ کمروں کی کایا ایکا ایکی کیسے پلٹی سمجھ میں کچھ نہ آیا بس سوچ لیا کہ کہیں سے مہمان آئے ہوں گے -

دوسرے دن کوٹھی کا چولا بدلا نظر آیا . دور سے پتا چل رہا تھا کہ سفیدی ہوئی ہے پھاٹک کے باہر قلعی کے ادھ بھرے ڈول بھی رکھے تھے - کہ جیسے راج کام کرتے کرتے انہیں چھوڑ گئے ہیں - اور آ کے پھر کام سے لگ جائیں گے میرے قدم نادانستہ تیز تیز اٹھنے لگے کوٹھی کے قریب پہنچتے ہی میری نگاہ نے اسی باہر والی دیوار کو ٹٹولا - دل دھک سے رہ گیا - ساری دیوار پر سفیدی پُتی ہوئی تھی اور سفیدی پر لفظوں ، شوشوں اور خموں سے پورا ہوا وہ جالا سفیدی میں ڈوب چکا تھا - اچانک پھر کسی نے میرا رستہ کاٹ دیا اور ایک ان دیکھی رسی مجھے جکڑے لے رہی تھی -

ہاتھ میں وہی لمبی سی قینچی باہر کی روش پہ دو رویہ جھاڑیوں کی ہری ہری گھنی شاخوں اور پھننگوں کو تیزی سے کاٹتا چلا جا رہا تھا - اب تو واقعی مجھ سے ضبط نہ ہو سکا - یوں بھی اب وہ مالی ہی لگتا تھا - کوئی پراسرار مخلوق نہیں نظر آتا تھا کہ مجھے جھجک ہوتی - اس کے قریب سے گزرتے ہوئے سادگی سے رکا اور اسی سادگی سے پوچھا انجینئر صاحب کے آج تو بہت مہمان آئے معلوم ہوتے ہیں -

”مہمان تو کوئی نہیں“ مالی کی قینچی اسی طرح چلتی رہی - ”نئے انجینئر صاحب کے گھر والے ہیں -“

نئے انجینئر صاحب ! میں چونکا اور نگاہ فوراً نام کی تختی پر گئی

تختی واقعی بدلی ہوئی تھی - مالی اسی طرح ہاتھ روکے بغیر سادگی سے بولا -

"ہاں جی اب نئے انجینئر صاحب آ گئے ہیں - پہلے انجینئر صاحب تو گئے -"

"کہاں ؟"

"انھوں نے پلشن لے لی -"

"پلشن ! اچھا ؟" مجھے یہ بات نہ جانے کیوں اتنی عجیب معلوم دے رہی تھی چند لمحے خاموشی رہی - بس ہری شاخوں میں قینچی کے در در کرنے کی آواز آتی رہی پھر مالی آپ ہی آپ بولا اور اس مرتبہ اس کی آواز میں افسوس کی بھی ایک کیفیت تھی " اجی اچھا ہی ہوا کہ ان کی پلشن ہوگئی جب سے ان کا بیٹا مرا تھا ان کا دماغ چل بے چل ہوگیا تھا -"

"بیٹا ؟ اچھا بیٹا مر گیا تھا انجینئر صاحب کا ؟" یک بیک الجھی ہوئی ڈور کا سرا ملتا دکھائی دیا -

"نئیں جی وہ بیٹا نئیں تھا -" مالی نے قینچی روکی - قینچی زمین پر ڈال کمر سیدھی کر میری طرف کر کے کھڑا ہوگیا -" انجینئر صاحب بچارے تو اکیلے تھے وہ ان کا لَے پالک تھا - بہت لاڈ کرتے تھے اس کا - بس دو دم تھے ، انجینئر اور لَے پالک ، اور کیا دیکھنا رہ گیا تھا انھیں بس اسی کو دیکھ دیکھ جیتے تھے - نہ کسی سے ملنا ، نہ کسی کے پاس جانا نہ کوئی میل ملاقاتی ، دفتر یا دورہ واں سے سیدھے گھر ، نہ کوئی قصہ ، نہ بکھیڑا اسی کے ساتھ مگن رہتے تھے - - - - آسے لو لگ گئی کلی کی طریوں مرجھا گیا - - - -"

مالی کسی سوچ میں ڈوب گیا - - - - پھر آپ ہی آپ بڑ بڑایا "انجینئر صاحب پھر اکیلے رہ گئے بہت دکھی رہتے تھے - بچارے بالکل کھوئے کھوئے رہنے لگے تھے - نوکری ہی سے جی اچٹ

گیا تھا - اب دورے پہ بھی ایسے ویسے ہی جاتے تھے بس آسی کا خیال ہر وقت رہتا تھا - اس کی ایک ایک چیز کو ، گیند اور بلے کو سنبھال کے رکھ چھوڑا تھا - اچھا ہی ہوا پلشن لے لی ، بالکل چل بے چل ہوگئے تھے -" اس نے آہستہ سے جھک کر قینچی اٹھائی اور میری طرف دیکھے بغیر دوسری روش کی طرف ہو لیا - کھلے میدان میں کہیں کہیں بہت دور اکا دکا خواب میں چلتی پھرتی ہوئی بھینسیں پھر وہ دو رویہ آموں کے بے ثمر درخت کہ ختم ہونے میں نہ آتے تھے - مشن سکول کی سرخ عمارت ، عمارت سے بہت آگے نکل کر بھٹے کی کالی کالی چپ چاپ چمنیاں جو قریب ہونے کے بجائے دور ہوتی نظر آ رہی تھیں - اس روز وہ لمبی اونچی نیچی گرد آلود سڑک کہ کبھی سیدھی چلتی اور کبھی ٹیڑھ کھاتی دکھائی دیتی اتنی لمبی لگی کہ میں بیزار ہو کر ریل کی پٹڑی کو چھوئے بغیر واپس ہو لیا -

---

امتیاز علی تاج

(۱۹۰۰ء تا ۱۹۷۰ء)

آرام و سکون

ڈاکٹر : جی نہیں بیگم صاحبہ ! تردّد کی کوئی بات نہیں میں نے بہت اچھی طرح معائنہ کر لیا ہے ۔ صرف تھکان کی وجہ سے حرارت ہو گئی ہے ۔ ان دنوں آپ کے شوہر غالباً کام بہت زیادہ کرتے ہیں۔

بیوی : ڈاکٹر صاحب ! ان دنوں کیا ، ان کا ہمیشہ یہی حال ہے۔ صبح دس بجے دفتر جا کر شام کے سات بجے سے پہلے کبھی واپس نہیں آتے۔

ڈاکٹر : جبھی تو ! میرے خیال میں انہیں دوا سے زیادہ آرام اور سکون کی ضرورت ہے ۔ کاروبار کی پریشانیاں اور الجھنیں بھلا کر ایک ہی روز آرام و سکون سے گزارا تو طبیعت ان شاء اللہ بحال ہو جائے گی ۔

بیوی : بیسیوں مرتبہ کہہ چکی ہوں ۔ اتنا کام نہ کیا کرو ، نہ کیا کرو ۔ نصیب دشمناں صحت سے ہاتھ دھو بیٹھو گے مگر خاک اثر نہیں ہوتا ۔ ہمیشہ یہی کہہ دیتے ہیں ، کیا

کیا جائے۔ ان دنوں کام بے طرح زور پر ہے۔

ڈاکٹر : ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام و سکون کے لیے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

بیوی : یہ بات آپ نے انھیں بھی سمجھائی ؟ میں نے کہا سن رہے ہو ، ڈاکٹر صاحب کیا کہہ رہے ہیں۔

میاں : ہوں !

ڈاکٹر : جی ہاں۔ میں نے سمجھا کر اچھی طرح تاکید کر دی ہے ، کہ دن بھر خاموش لیٹے رہیں۔

بیوی : تو تاکید کیا میں نہیں کرتی ؟ مگر ان پر کسی کے کہنے کا کچھ اثر بھی ہو !

ڈاکٹر : جی نہیں ابھی انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ پورے طور سے میری ہدایات پر عمل کریں گے۔

بیوی : اور دوا کس کس وقت دینی ہے ؟

ڈاکٹر : جی نہیں۔ دوا کی مطلق ضرورت نہیں۔ بس آپ صرف ان کے آرام اور سکون کا خیال رکھیے۔ غذا جو کچھ دینی ہے ، میں لکھ چکا ہوں۔

بیوی : بڑی مہربانی آپ کی۔

ڈاکٹر : تو پھر اجازت ؟

بیوی : فیس میں آپ کو بھجوا دوں گی۔

ڈاکٹر : اس کی کوئی بات نہیں۔ آ جائے گی۔

بیوی : (اونچی آواز سے پکار کر) ارے للو۔ میں نے کہا ڈاکٹر صاحب کا بیگ باہر کار میں پہنچا دیجیو۔

ڈاکٹر : ایک بات عرض کر دوں بیگم صاحبہ۔ مریض کے کمرے

میں شور و غل نہیں ہونا چاہیے ۔ اعصاب پر اس کا بہت مضر اثر پڑتا ہے ۔ خاموشی اعصاب کو ایک طرح کی تقویت بخشتی ہے ۔

بیوی : مجھے کیا معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب ۔ آپ اطمینان رکھیں ان کے کمرے میں پرندہ پر نہ مارے گا ۔ (ملازم آتا ہے)

للو : حضور !

ڈاکٹر : اٹھا لو یہ بیگ ۔ تو آداب !

بیوی : (ڈاکٹر اور ملازم جاتے ہیں ، قریب آ کر) میں نے کہا سو گئے کیا ؟

میاں : ہوں ! یونہی چپکا پڑا ہوا تھا ۔

بیوی : بس بس ۔ بس بس چپکے ہی پڑے رہیے ۔ ڈاکٹر صاحب بہت سخت تاکید کر گئے ہیں کہ آپ بات کریں نہ کوئی آپ کے کمرے میں بات کرے ۔ اس سے بھی تھکان ہوتی ہے ۔ تمام وقت پورے آرام اور سکون سے گزاریں ۔ سمجھ گئے نا ؟

میاں : ہوں (کراہتا ہے) ۔

بیوی : کیوں بدن ٹوٹ رہا ہے کیا ؟

میاں : ہوں ۔

بیوی : کہو تو دبا دوں ؟

میاں : ہوں ۔

بیوی : سونے کو جی چاہ رہا ہو تو چلی جاؤں ؟

میاں : اچھی بات ۔ (کراہتا ہے) ۔

بیوی : اگر پیچھے کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ؟ اچھا بلانے کی گھنٹی پاس رکھے جاتی ہوں ۔ گھنٹی کہاں گئی ؟ رات

میں نے آپ یہاں میز پر رکھی تھی - اللہ جانے یہ کون
اللہ مارا میری چیزوں کو الٹ پلٹ کرتا ہے ؟
(کنڈی کی آواز) کون ہے یہ نامراد ؟ ارے للو ! دیکھو

بیوی : یہ کون کواڑ توڑے ڈال رہا ہے ؟

للو : (دور سے) سقہ ہے بیوی جی !

بیوی : سقہ ! گھر میں بھرے بستے ہیں - کمبخت اس زور سے
کنڈی کھٹکھٹاتا ہے ؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو
نہیں آتا کہ گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے - ڈاکٹر نے تاکید
کر رکھی ہے کہ شور و غل نہ ہونے پائے اور اس سے
کہو یہ کیا وقت ہے ، پانی لانے کا - اچھی خاصی دوپہر
ہونے کو آگئی ہے - کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری
سے الگ کر دوں گی - میں نامراد کو بیسیوں مرتبہ
کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے - کان پر
جوں ہی نہیں رینگتی -

میاں : ارے بھئی اب بخشو اسے -

بیوی : بخشوں کیسے ؟ ذرا طرح دو یہ لوگ سر پر سوار ہو
جاتے ہیں -

میاں : ہوں - (کراہتا ہے) -

بیوی : کیوں - زیادہ درد محسوس ہو رہا ہے ؟

میاں : ہوں -

بیوی : للو سے کہوں آکر دبا دے ؟

میاں : اوں ہوں !

بیوی : یہ دیکھو - یہاں انگیٹھی پر رکھی ہے - آپ بتائیے آپ
سے آپ آگئی یہاں ؟ پاؤں تھے اس کے ؟ یہ سب حرکتیں

اس للو کی ہیں - کم بخت نے قسم کھا رکھی ہے کہ کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر رہنے نہ دے گا - اللہ جانے یہ نامراد میری چیزوں کو ہاتھ لگاتا کیوں ہے ؟ او للو ! ارے للو !

میاں : ارے بھئی کیوں ناحق غل مچا رہی ہو - گھنٹی رات میں نے خود میز پر سے اٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دی تھی - ہوں (کراہتا ہے) -

بیوی : تم نے ؟ اے ہے وہ کیوں ؟

میاں : ننھا بار بار بجائے جا رہا تھا - میرا دم الجھنے لگا تھا - ہوں (کراہتا ہے) -

للو : (آ کر) مجھے بلایا ہے بیوی جی ؟

بیوی : کم بخت - اتنی دیر سے آوازیں میں دے رہی ہوں ، کہاں مر گیا تھا ؟

للو : آپ نے ریٹھے کوٹنے کو کہا - وہ گودام میں ڈھونڈ رہا تھا -

میاں : ہوں (کراہتا ہے) -

بیوی : صبح سویرے کہا تھا ، کم بخت تجھے اب تک ریٹھے مل نہیں چکے ؟

للو : جی مہلت بھی ملے - ادھر گودام میں جاتا ہوں ، ادھر کوئی بلا لیتا ہے -

بیوی : ہاں بڑا کام رہتا ہے نا بچارے کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی - بھاگ یہاں سے نکل ، جا کر ریٹھے ڈھونڈ (للو جاتا ہے) -

بیوی : تو یہ گھنٹی یہاں تمہارے سرہانے رکھ جاتی ہوں -

میاں : (کراہ کر) کواڑ بند کرتی جانا ۔

بیوی : پیچھے اکیلے میں جی تو نہ گھبرائے گا تمھارا ؟

میاں : (تنگ آ کر) نہیں بابا نہیں ۔

بیوی : ارے ہاں ۔ یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کھانے کے لیے کیا کیا چیزیں لکھ گئے ہیں ۔ کہاں گیا ان کا لکھا ہوا کاغذ ؟ اے لو یہ نیچے پڑا ہوا ہے ۔ ابھی کہیں کوڑے میں چلا جاتا تو ۔ ہوں ۔ مالٹڈ ملک MALTED MILK نارنگی کا رس، ساگو دانے کی کھیر ، یخنی ، کیا تیار کرا دوں اس وقت کے لیے ؟

میاں : جو جی چاہے ۔

بیوی : اس میں میرے جی چاہنے کا کیا سوال ؟ کھانا آپ کو ہے یا مجھ کو ؟

میاں : ساگودانہ بنا دینا تھوڑا سا ۔

بیوی : بس ؟ اس سے کیا بنے گا ۔ یخنی پی لیتے تھوڑی سی ۔ چوزے کی یخنی بنوائے دیتی ہوں ۔ مقوِّی چیز ہے ۔

میاں : بنوا دو ۔

بیوی : (دو قدم چلتی ہے) مگر میں نے کہا ، دیر لگ جائے گی یخنی کی تیاری میں ، چوزہ بازار سے منگوانا ہوگا اس للو اللہ مارے کو تو جانتے ہو ۔ بازار جاتا ہے تو وہیں کا ہو رہتا ہے ۔

میاں : اوں ۔ ہوں ۔

بیوی : تو پھر یوں کرتی ہوں ۔ (صحن میں بچہ پٹ پٹ گاڑی چلانے لگتا ہے) ۔

میاں : ارے بھئی ۔ اب یہ کیا کھٹ پھٹ شروع ہو گئی ۔

بیوی : ننھا ہے آپ کا - عید کے روز میلے میں سے یہ کھلونا گاڑی لے آیا تھا - نہ اس کم بخت کا دل اس سے بھرتا ہے ، نہ وہ کم بخت ٹوٹتی ہے - ارے میں نے کہا ننھے نہیں مانے گا نامراد ؟ چھوڑ اس اپنی پٹ پٹ کو - جب دیکھو لیے لیے پھر رہا ہے - صاحبزادے کا دل کسی طرح پر ہونے ہی میں نہیں آتا - چولھے میں جھونک دوں گی اس کم بخت کو ، اتنا خیال بھی نہیں آتا کہ ابا بیمار پڑے ہیں - شور و غل سے ان کی طبیعت گھبراتی ہے -

میاں : ہوں - (کراہتا ہے) -

بیوی : کم نہیں ہوا درد ؟

میاں : اوں - ہوں -

بیوی : دبوا لیتے تو گھٹ جاتا -

میاں : اوں ہوں -

بیوی : تو میں کیا کہہ رہی تھی ؟ کھانے کا پوچھ رہی تھی - (پھر ننھے کی پٹ پٹ کی آواز پھر وہی - نہیں مانے گا نامراد ، ٹھہر تو جا -) غصے میں جاتی ہے - میاں کراہتا ہے - دور سے بیوی کی آواز آ رہی ہے) -

چھوڑ اپنی یہ پٹ پٹ - (بچہ رونے لگتا ہے) - چپ نامراد ، اتنا خیال نہیں ابا بیمار پڑے ہیں - ڈاکٹر نے کہا ہے شور و غل نہ ہو - انھیں تکلیف ہوگی - چپ ! خبردار جو آواز نکالی گلا گھونٹ ڈالوں گی - (بچہ رونا بند کرنے کی ناکام کوشش کرتا ہے) کم بخت کا جو کھیل ہے ، ایسا ہی بے ڈھنگا ہے - چل ادھر - نہیں چپ ہوگا - تو ؟ (کھینچتی ہوئی لے جاتی ہے میاں اس ہنگامے سے زچ ہو کر کراہے جا رہا ہے - بیوی کی آواز غائب ہوتے ہی

کمرے میں جھاڑو پھرنے کی آواز آنے لگتی ہے) -

میاں : (چونک کر) ہوں ؟ ارے بھئی یہ گرد کہاں سے آنے لگی - لاحول ولا قوۃ ، ارے کیا ہو رہا ہے ؟

ملازم : جھاڑو دے رہا ہوں میاں -

میاں : کم بخت دفع ہو یہاں سے -

ملازم : جھاڑو نہ دی تو خفا ہوں گی بی بی جی -

میاں : بی بی جی کا بچہ نکل یہاں سے - کہہ دے آن سے (ملازم جاتا ہے) - کواڑ بند کر کے جا - (میاں کراہ کر چپ ہو جاتا ہے ، ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے اور بجتی رہتی ہے) ارے بھئی کہاں گئیں ؟ ارے کوئی ٹیلیفون سننے تو آؤ - لاحول ولا قوۃ - (خود اٹھتا ہے) ہیلو میں اشفاق بول رہا ہوں - بیگم اشفاق کسی کام میں مصروف ہیں - اس وقت کمرے میں نہیں ہیں - جی - یہاں کوئی ایسا نہیں جو انھیں بلا لائے - میں علیل ہوں - کیا فرمایا آپ نے ؟ آواز دینے کے لیے ضروری نہیں گلا بھی خراب ہو - آپ پھر کسی وقت فون کر لیجیے گا - میں نے عرض کیا نا ، چونکہ میں بیمار ہوں ، کمرے سے باہر نہیں جا سکتا - (زور سے فون بند کرتا ہے) بد تہذیب - گستاخ کہیں کی - ہوں -

بیوی : مجھے بلایا تھا ؟ ہے ہے تم اٹھے کیوں ؟

میاں : اتنی آوازیں دیں کوئی سنے بھی -

بیوی : توبہ توبہ ، لیٹو لیٹو ، میں ذرا گودام میں چلی گئی تھی - اے للو کو ریٹھے نکال کر دے رہی تھی - بلایا کیوں تھا ؟ (ہمسائے کے ہاں گانا شروع ہوتا ہے) -

میاں : فون تھا تمہارا ؟

بیوی : کس نے کیا تھا ؟

میاں : ہوگا کوئی اب مجھے کیا پتا۔

بیوی : جب آٹھ ہی کھڑے ہوے تھے تو نام پوچھ لینا کوئی گناہ تھا۔

میاں : میں نے کہ دیا تھا پھر کر لیں فون۔

بیوی : مفت کی الجھن میں ڈال دیا۔ اللہ جانے کون تھی اور کیا چاہتی تھی۔

میاں : اے بھئی کوئی ایسا ضروری کام نہ تھا۔ ورنہ مجھے پیغام نہ دے دیتیں۔ تم خدا کے لیے ان ہمسائے کے صاحبزادے کا ہارمونیم اور گانا بند کراؤ۔ میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

بیوی : اب اسے کیونکر روک دوں میں ؟

میاں : بابا ایک دفعہ لکھ کر بھیج دو۔ میں بیمار ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میرے لیے آرام اور سکون کی ضرورت ہے۔ ایک روز ان صاحبزادے نے نغمہ سرائی نہ فرمائی تو دنیا کسی بہت بڑی نعمت سے محروم نہ ہو جائے گی !

بیوی : کہے تو دیتی ہوں مگر کہیں چڑ نہ جائیں۔

میاں : مناسب الفاظ میں لکھو نا۔ ہوں (کراہتا ہے)۔

(بے سرے گانے گانے کا شور جاری ہے۔ میاں کراہ رہا ہے۔ یک لخت بچے کے رونے کی آواز)۔

بیوی : ارے کیا ہوگیا ننھے۔

بچہ : (زور سے) گر پڑا خون نکل آیا۔

بیوی : (زور سے) خط لکھ رہی ہوں ابھی آئی چپ ہو جا۔

میاں : (کراہتے ہوے) یک نہ شد دو شد۔

بیوی : توبہ آپ تو بوکھلا دیتے ہیں۔ انسان ہوں دیکھ رہے ہیں، خط لکھ رہی ہوں۔ بچے کو چپ کیونکر کرا سکتی ہوں۔ نامراد چپ ہو جا۔ خون نکل آیا تو کیا قیامت آ گئی۔ ابھی آ رہی ہوں دو سطریں لکھ لوں۔

(میاں کراہتا ہے۔ بے سرے گانے اور بچے کے رونے کی آواز جاری ہے)۔

میاں : ختم نہیں ہوا خط ؟ جانے کیا دفتر لکھنے بیٹھ گئی ہو۔

بیوی : ابھی ہوا جاتا ہے ختم۔

(اس غل میں ایک فقیر کی آواز بھی شامل ہو جاتی ہے)۔

فقیر : بال بچے کی خیر۔ راہ مولا کچھ مل جائے فقیر کو۔

میاں : (کراہ کر) بس ان ہی کی کسر رہ گئی تھی۔ ہوں۔

بیوی : تو اب میں تو اسے بلا کر لے نہیں آئی۔

میاں : ارے تو خدا کے لیے اسے رخصت تو کر آؤ۔

بیوی : او للو ! ارے او للو !

(للو ہاون دستے میں ریٹھے کوٹنے شروع کر دیتا ہے بے سرے گانے میں بچے کے رونے اور فقیر کی صدائیں اور ہاون دستے کی دھمک اور شامل ہو جاتی ہے)۔

میاں : ہائے توبہ، توبہ، ہائے۔

بیوی : ارے نامراد ریٹھے پھر کوٹ لینا۔ پہلے اس فقیر کو رخصت تو کر دے۔

(للو ریٹھے کوٹنے میں بیوی کی آواز نہیں سنتا)

میاں : (جلدی جلدی کراہتا ہوا گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہے) میری ٹوپی اور شیروانی دینا۔

بیوی : ٹوپی اور شیروانی ! !

میاں : ہاں میں دفتر جا رہا ہوں۔ ابھی دفتر جا رہا ہوں۔

بیوی : ہے ہے وہ کیوں ؟

میاں : آرام اور سکون کے لیے۔

میرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء)

مکاتیب

(۱)

نواب علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

جان غالب !

تم تو ثمر نورس[1] ہو اس نہال[2] کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ اور سایہ نشین اوس نہال کا رہا ہوں۔ کیونکر تم مجھ کو عزیز نہ ہو گے ؟ رہی دید وا دید، اس کی دو صورتیں ہیں : تم دلی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو، جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو، عالم دو ہیں : ایک عالم ارواح اور ایک عالم آب و گل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے، جو خود فرماتا ہے "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ"[3] ؟ اور پھر آپ جواب دیتا ہے "لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّار"[4]۔

---

۱ - نواب امین الدین احمد خاں والی لوہارو کے بڑے صاحبزادے اور وارث ریاست جن کا ۱۸۸۴ء میں انتقال ہوا۔

۲ - امین الدین احمد خاں والیٔ لوہارو۔

۳ - آج بادشاہت کس کی ہے ؟

۴ - اس خدائے واحد کی جو قہار ہے (سورۂ مومن)

ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالم آب و گل کے مجرم عالم ارواح میں سزا پاتے ہیں ، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالم ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں چنانچہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں روبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا ۔ تیرہ برس حوالات میں رہا ۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا ۔ ایک بیڑی[1] میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا ۔ فکر نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا ۔ برسوں کے بعد میں جیل خانہ سے بھاگا ۔ تین برس بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا[2] پایان کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے ۔ پھر اسی محبس میں بٹھا دیا ۔ جب دیکھا کہ یہ قیدی گریز پا ہے دو ہتکڑیاں[3] اور بڑھا دیں پاؤں بیڑی سے فگار ، ہاتھ ہتکڑیوں سے زخم دار ۔ مشقت مقرری اور مشکل ہوگئی ۔ طاقت یک قلم زائل ہوگئی ۔ بے حیا ہوں ۔ سال گذشتہ بیڑی کو زاویۂ زنداں میں چھوڑ مع دونوں ہتکڑیوں کے بھاگا[4] ۔ میرٹھ مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا ۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا ۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا ۔ بھاگوں گا کیا ؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی ۔ حکم رہائی دیکھیے کب صادر ہو ؟ ایک

---

۱ ۔ شادی ۔

۲ ۔ سفر کلکتہ جس میں مرزا کو کانپور ۔ لکھنؤ ۔ باندہ ۔ بنارس ۔ عظیم آباد ۔ مرشد آباد وغیرہ جانے کا موقع ملا ۔

۳ ۔ باقر علی خاں اور حسن علی خاں فرزندان عارف ۔

۴ ۔ سفر رام پور کی طرف اشارہ ہے ۔

ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں۔ بہر تقدیر بعد رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعد نجات سیدھا عالم ارواح کو چلا جاؤں گا:

فرخ آن روز کہ از خانۂ زندان بروم
سوئے شہر خود ازیں وادیٔ ویران بروم

غالب

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ (جون ۱۸۶۱ء)

(۲)

نواب علاءالدین احمد خاں علائی

میری جان!

نئے مہمان کا قدم تم پر مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ تمھاری اور اس کی اور اس کے بھائیوں کی عمر دراز کرے۔ تمھاری تحریر سے صاف نہیں معلوم ہوتا کہ سعید ہے یا سعیدہ ہے۔ ثاقب اس کو عزیز اور غالب عزیزہ جانتا ہے۔ واضح لکھو تا کہ احتمال رفع ہو۔ خط ثاقب کے نام کا۔ توبہ توبہ، خط کا ہے کو ایک تختہ کاغذ کا ہے۔ میں نے سراسر پڑھا۔ لطیفہ و بذلہ و شوخی و شوخ چشمی کا بیان جب کرتا کہ فحوائے عبارت سے جگر خون نہ ہو جاتا۔ بھائی کا غم جدا، ایسا سخن گزار، ایسا زبان آور، ایسا عیار و طرار! یوں عاجز و درماندہ واز کار رفتہ ہو جائے! تمھارا غم جدا، ساغر اول و درد۔ کیا دل لے کر آئے۔ کیا زبان لے کر آئے۔ کیا علم لے کر آئے، کیا عقل لے کر آئے اور پھر کسی روش کو برت نہ سکے۔ کسی شیوہ کی داد نہ پائی۔

بھائی اس معرض میں، میں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں، مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا۔ آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار یک، ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقت جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسی کے لٹکا لوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

خدا کا مقہور، خلق کا مردود، بوڑھا، نا تواں، بیمار، فقیر، نکبت میں گرفتار۔ تمہارے حال میں غور کی اور چاہا کہ اس کا نظیر بہم پہنچاؤں۔ واقعۂ کربلا سے نسبت نہیں دے سکتا، لیکن واللہ تمھارا حال اس ریگستان میں بعینہٖ ایسا ہے، جیسا مسلم بن عقیل کا حال کوفے میں تھا۔ تمھارا خالق تمھاری اور تمھارے بچوں کی آبرو کا نگہبان۔ میرے اور معاملات کلام و کمال سے قطع نظر کرو، وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے وہ میں ہوں۔

صبح دوشنبہ شانزدہم ازمہ صیام ۱۲۸۱ھ

(۱۳ - فروری ۱۸۶۵ء)

(۳)

میر مہدی مجروح[1]

اے جناب میرن صاحب ، السلام علیکم

"حضرت آداب"

"کہو صاحب آج اجازت ہے ، میر مہدی کے خط کا جواب لکھنے کی ؟"

"حضرت میں کیا منع کرتا ہوں ، میں نے تو یہ عرض کیا تھا کہ اب وہ تندرست ہوگئے ہیں - بخار جاتا رہا ہے ، صرف پیچش باقی ہے - وہ بھی رفع ہو جائے گی - میں اپنے ہر خط میں آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں - آپ پھر کیوں تکلیف کریں ؟"

"نہیں میرن صاحب ! اس کے خط کو آئے ہوئے بہت دن ہوئے ہیں - وہ خفا ہوا ہوگا - جواب لکھنا ضرور ہے"

"حضرت وہ آپ کے فرزند ہیں آپ سے کیوں خفا ہوں گے ؟"

"بھائی آخر کوئی وجہ تو بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں باز رکھتے ہو ؟"

"سبحان اللہ ، اے لو حضرت ، آپ تو خط نہیں لکھتے اور

---

۱ - میر حسین فگار دہلوی کے فرزند اور مرزا غالب کے نہایت عزیز شاگرد تھے ۱۸۳۳ء کے قریب غالب کے شاگرد ہوئے - ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اپنے بھائی سرفراز حسین اور میرن صاحب کے ساتھ ہی پانی پت چلے گئے تھے - ہنگامہ فرو ہونے کے بعد الور چلے گئے تھے مہاراجہ کی وفات (۱۸۷۴ء) پر یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور مجروح نے چند سال جے پور میں گزارے پھر حامد علی خاں نواب رامپور نے انھیں اپنے پاس بلا لیا - آخری عمر فراغت سے گزری - ۱۹۰۳ء کو دہلی میں انتقال ہوا -

مجھے فرماتے ہیں کہ تو باز رکھتا ہے۔"

"اچھا تم باز نہیں رکھتے ، مگر یہ تو کہو کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ میں میر مہدی کو خط لکھوں ؟"

"کیا عرض کروں ، سچ تو یہ ہے کہ جب آپ کا خط جاتا اور وہ پڑھا جاتا تو میں سنتا اور حظ اٹھاتا ۔ اب جو میں وہاں نہیں ہوں تو نہیں چاہتا کہ تمھارا خط جاوے ۔ میں اب پنجشنبہ کو روانہ ہوتا ہوں ۔ میری روانگی کے تین دن کے بعد آپ خط شوق سے لکھیے گا ۔"

"میاں بیٹھو ، ہوش کی خبر لو ۔ تمھارے جانے نہ جانے سے مجھے کیا علاقہ ؟ میں بوڑھا آدمی ، بھولا آدمی ، تمھاری باتوں میں آ گیا اور آج تک اسے خط نہیں لکھا ۔ لاحول ولا قوۃ ۔"

سنو میر مہدی صاحب ، میرا کوئی گناہ نہیں ۔ میرے خط کا جواب لکھو ۔ تپ تو رفع ہوگئی ہوگی ، پیچش رفع ہونے کی خبر شتاب لکھو ۔ پرہیز کا بھی خیال رکھا کرو ۔ یہ بری بات ہے کہ وہاں کچھ کھانے کو ملتا ہی نہیں ۔ تمھارا پرہیز اگر ہوگا بھی تو "عصمت بی بی از بے چادری" ہوگا ۔

حالات یہاں مفصل میرن صاحب کی زبانی معلوم ہوں گے ۔ دیکھو بیٹھے ہیں ۔ کیا جانوں ۔ حکیم میر اشرف علی میں اور ان میں کچھ کونسل تو ہو رہی ہے ۔ پنجشنبہ روانگی کا دن ٹھہرا تو ہے ۔ اگر چل نکلیں اور پہنچ جائیں تو ان سے یہ پوچھو کہ جناب ملکۂ انگلستان کی سالگرہ کی روشنی کی محفل میں تمھاری کیا گت ہوئی تھی اور یہ بھی معلوم کر لیجیو کہ جو فارسی مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" ، اس کے معنی کیا ہیں ؟ پوچھیو اور نہ چھوڑیو جب تک یہ نہ بتائیں ۔

اس وقت پہلے تو آندھی چلی ، پھر مینہ برسا ۔ اب مینہ برس

رہا ہے ۔ میں خط لکھ چکا ہوں ۔ سرنامہ لکھ کر رکھ چھوڑوں گا ۔ جب ترشح موقوف ہو جائے گا تو کلیان ڈاک کو لے جائے گا ۔

میر سرفراز حسین کو دعا پہنچے ۔ اللہ اللہ تم پانی پت کے سلطان العلماء اور مجتہد العصر بن گئے ۔ کہو وہاں کے لوگ تمہیں قبلہ و کعبہ کہنے لگے یا نہیں ؟ میر نصیر الدین کو دعا کہنا ۔

۱۸۶۱ء غالب

بنام منشی ہرگوپال تفتہ
(۲)

کیوں صاحب ، روٹھے ہی رہو گے یا کبھی منو گے بھی ؟ اور اگر کسی طرح نہیں منتے تو روٹھنے کی وجہ تو لکھو ۔ میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں ، یعنی جس کا خط آیا ، میں نے جانا کہ وہ شخص تشریف لایا ۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا ، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں ۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے ، ایک دو صبح کو ، ایک دو شام کو ۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے ۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گزر جاتا ہے ۔ یہ کیا سبب ؟ دس بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا ، یعنی تم نہیں آئے ۔ خط لکھو ، صاحب ، نہ لکھنے کی وجہ لکھو ۔ آدھ آنے میں بخل نہ کرو ۔ ایسا ہی ہے تو بیرنگ بھیجو ۔ غالب

سوموار ۲۷ ۔ دسمبر ۱۸۵۸ء

سید احمد خاں

(۱۸۱۷ء تا ۱۸۹۸ء)

قومی اتفاق

قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کِسی قدر غور کرنا لازم ہے۔ زمانہٴ دراز سے جس کی ابتداء تاریخی زمانے سے بھی بالاتر ہے قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کا باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم بِاَبِی اَنْتَ وَ اُمِّی نے اس تفرقہٴ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا مٹا دیا اور ایک روحانی رشتہٴ قومی قائم کیا جو ایک حبل المتین :

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

سے مضبوط تھا۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس رُوحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہوگئے اور ایک نیا روحانی بلکہ خدائی قومی رشتہ قائم ہوگیا۔

اسلام کسی سے نہیں پُوچھتا کہ وہ تُرک ہے یا تاجیک، وہ افریقہ کا رہنے والا ہے یا عرب کا، وہ چین کا باشندہ ہے یا ما چین کا، وہ پنجاب میں پیدا ہوا ہے یا ہندوستان میں، وہ کالے رنگ کا ہے یا گورے رنگ کا، بلکہ جس کسی نے عروۃ الوثقٰی کلمہٴ توحید کو مستحکم کیا وہ ایک قوم ہوگیا! بلکہ ایک رُوحانی باپ کا بیٹا!

کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہے :

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ[1] ۔

کون شخص ہے جو دو بھائیوں کو ایک باپ کا بیٹا نہیں جانتا ؟ پھر جب کہ خود خدا نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی فرمایا ہے تو ہم سب کا ایک روحانی باپ کی اولاد ہونے میں کیا شک رہا ؟

مجھے اس بات کے دیکھنے سے نہایت افسوس ہے کہ ہم سب آپس میں بھائی تو ہیں ، مگر مثل برادرانِ یُوسف کے ہیں ۔ آپس میں دوستی اور محبّت ، یک دلی اور یک جہتی بہت کم ہے ۔ حسد ، بُغض و عداوت کا ہر جگہ اثر پایا جاتا ہے جس کا نتیجہ آپس کی نا اتفاق ہے ۔ شیطان ، جس نے خدا سے وعدہ کیا کہ "لَاَ قْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ[2]" ایک مقدس اور بظاہر نہایت نورانی حیلے سے آپس میں بھائیوں کے ، جن کو کہ خدا نے بھائی بنایا ہے ، نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور جس طرح کہ ہمارے باپ حضرت آدمؑ اس کے دھوکے کو خالص دوستی سمجھ کر دھوکے میں آگئے ، اسی طرح ہم بھی اس کے دھوکے میں آ جاتے ہیں اور اس نفاق کو جو ہر حالت میں مردود ہے ، ایک مقدس لباس پہناتے ہیں ، یعنی "مذہبی مقدس لباس کا خلعت" اسے عنایت کرتے ہیں ۔

کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا ہے کہ

مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَھُوَ مُسْلِمٌ ۔ مَنِ اسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا فَھُوَ مُسْلِمٌ وَمَنْ ھُوَ مُسْلِمٌ فَھُوَ اَخٌ[3] ۔

---

۱ ۔ بے شک تمام مومن آپس میں بھائی ہیں ۔ پس اپنے بھائیوں کے مابین مصالحت کرواؤ اور اللہ سے ڈرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے ۔

۲ ۔ میں ضرور ان کو تیری صراط مستقیم سے ہٹا کر رہوں گا ۔

۳ ۔ جس شخص نے لا الٰہ الا اللہ کہا وہ مسلمان ہے ۔ جس نے ہمارے قبلے کو اپنا قبلہ بنایا وہ مسلمان ہے اور جو مسلمان ہے وہ ہمارا بھائی ہے ۔

امام اعظمؒ کا مذہب مشہور ہے :

لَا نُکَفِّرُ اَهلَ الْقِبلَةِ[1] -

با این ہمہ فروعی مسائل میں اختلاف ہونے کے سبب کس طرح ہماری قوم نے اس حبل المتین کی بندش کو توڑا ہے اور اس رشتۂ اخوت کو جسے خود خدا نے قائم کیا تھا ، چھوڑا ہے - جس قصبے اور شہر میں جاؤ ، جس مسجد اور امام باڑے میں گزرو ، باہم مسلمانوں کے شیعہ و سنی ، وہابی و بدعتی ، لا مذہب و مقلد ہونے کی بنا پر آپس میں نفاق و عداوت پاؤ گے -

ان نا اتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے - جمعیّت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے - قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نالائق نا اتفاق نے بہت کچھ اثر بد پہنچایا ہے - پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اول مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبّت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے مبدّل کریں -

یکتائی و یک جہتی سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد کو چھوڑ کر ایک عقیدے پر قائم ہو جائیں ، یہ امر تو قانونِ قدرت کے برخلاف ہے جو ہو نہیں سکتا - نہ تو پہلے کبھی ہوا ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا -

اتفاق کے قائم رکھنے کی جس کی ہم کو ضرورت ہے ایک اور عقلی و نقلی راہ ہے جس کی پیروی قومی اتحاد کا ذریعہ ہو سکتی ہے - انسان جب اپنی ہستی پر نظر ڈالے گا تو اپنے میں دو حصے پائے گا - ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے ابنائے جنس کا - انسان کا دل یا اس کا اعتقاد یا مختصر سے الفاظ میں یوں کہو کہ اس کا مذہب خدا کا حصہ ہے جس میں دوسرا کوئی شریک نہیں - اس کے عقائد

---

۱ - ہم اہل قبلہ کو کافر نہیں کہتے -

کی جو کچھ بھلائی یا برائی ہو اس کا معاملہ اس کے خدا کے ساتھ ہے - نہ بھائی اس میں شریک ہے ، نہ بیٹا ، نہ دوست ، نہ آشنا اور نہ قوم - پس ہم کو اس بات سے جس کا اثر ہر ایک کی صرف ذات تک محدود ہے اور ہم سے کِچھ تعلق نہیں ہے - کچھ بھی تعلق رکھنا نہیں چاہیے - ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی ، وہابی ہے یا بدعتی ، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے ، جبکہ وہ خُدا و خدا کے رسول ؐ کو برحق جانتا ہے ، کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیے ، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمے کا شریک سمجھنا اور اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے قائم رکھنا چاہیے -

نہایت افسوس اور نادانی کی بات ہے کہ ہم کسی سے ایسے امر میں عداوت رکھیں جس کا اثر خود اسی تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کچھ بھی ضرر و نقصان نہیں - جو حصّہ ابنائے جنس کا ہے اس سے ہم کو غرض رکھنی چاہیے اور وہ حصہ آپس کی محبت ، باہمی دوستی ، ایک دوسرے کی اعانت ، ایک دوسرے کی ہمدردی ہے جس کے مجموعے کا نام قومی ہمدردی ہے - یہی ایک طریقہ ہے جس سے خدا کے حکم کی بھی اطاعت اور آپس میں برادرانہ برتاؤ ، قومی اتفاق ، قومی ہمدردی قائم ہو سکتی ہے ، جو قومی ترقّی کے لیے پہلی منزل ہے -

یہ بات ہم کو بھولنی نہیں چاہیے کہ ان روحانی بھائیوں کے سوا اور بھی ہمارے وطنی بھائی ہیں - گو وہ ہمارے ساتھ اس کلمے میں جس نے ہم مختلف قوموں اور مختلف فرقوں کو ایک قوم اور آپس میں روحانی بھائی بنا دیا ہے ، شریک نہیں ہیں ، مگر بہت سے تمدنی امور ہیں جن میں ہم اور وہ مثل بھائیوں کے شریک ہیں - ہمسائے کا ادب ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور یہی ہمسائیگی وسعت پاتے پاتے ہم ملکی اور ہم وطنی کی وسعت تک پہنچ گئی ہے -

ان ہم وطن بھائیوں میں بھی دو حصّے ہیں ، ایک خُدا کا اور ایک ابنائے جنس کا - خُدا کا حصہ خُدا کے لیے چھوڑو اور جو حصہ ان میں ابنائے جنس کا ہے اس سے غرض رکھو - تمام امور انسانیت میں جو تمدن و معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں ایک دُوسرے کے مددگار رہو - آپس میں سچی محبت ، سچّی دوستی اور دوستانہ برد باریِ رکھو -

اتفاق کی خوُبیاں لوگوں نے بہت کچھ بیان کی ہیں اور وہ ایسی ظاہر ہیں کہ کوئی شخص اتفاق سے بھی ان کو بھول نہیں سکتا - بہت بڑے بڑے واقعات دنیا میں گزرے ہیں جن کو پرانی تاریخیں یاد دلاتی ہیں اور جن کی یاد سے ایک عجیب اثر ہمارے دلوں میں ہوتا ہے - وہ سب باہمی اتفاق کا نتیجہ ہے - ایک ناچیز ریشہٗ گیاہ جو نہایت کمزور ہوتا ہے باہمی اتّفاق سے ایسا قوی اور زبردست ہو جاتا ہے کہ بڑی سے بڑی قوت کا مقابلہ کرتا ہے - اس وقت تعلیم یافتہ دنیا میں جو کچھ ترقی ہے یا مہذب ملکوں میں جو کچھ طاقت ہے وہ سب اتفاق کی بدولت ہے -

بعض قابل ادب بزرگوں کا قول ہے کہ جس طرح اصلی دوستی دنیا میں ناپید ہے اسی طرح آپس کا اتّفاق بھی ناممکن ہے - ان کی دلیل یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبائع اور ان کے اغراض مختلف ہیں تو ضرور ہے کہ وہ ایک دوسرے کے مخالف ہوں - کوئی قوم مہذب یا نا مہذب ایسی نہیں پائی جائے گی جس میں باہم حسد و نفاق ، عداوت اور باہمی حقارت نہ پائی جاتی ہو - ہاں ! یہ بات سچ ہے مگر جس اتفاق پر ہم بحث کرتے ہیں وہ شخصی اتفاق نہیں ہے ، بلکہ قومی اتفاق ہے ! ہمارے آپس میں بمقتضاے بشریت گو کیسا ہی نفاق ہو ، جو خُدا کے نزدیک ایک سخت گناہ ہے ، مگر وہ قومی اتحاد اور قومی اتفاق کا مانع نہیں ہے - قومی بھلائی یا قومی برائی کا اثر قوم کے تمام لوگوں پر پہنچتا ہے ، اس لیے جلب منفعت یا دفع مضرت میں سب لوگ متفق ہو جاتے ہیں اور شخصی تنازعات کا اس وقت کچھ اثر باقی نہیں رہتا ہے -

اس زمانے میں جو سب سے بڑا سبب ہماری قوم کے تنزّل کا ہے وہ یہی ہے کہ ہم میں قومی اتفاق کا خیال نسیاً منسیا ہوگیا ہے - کسی کو بجز ذاتی منفعت کے قومی بھلائی یا قومی منفعت کا خیال بھی نہیں آتا ہے - اگر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اس کو پہلے اپنی ذاتی غرض مد نظر ہوتی ہے اور قومی بھلائی کے پردے سے اس کی پردہ پوشی کرنا چاہتا ہے - یہی وجہ ہے کہ ہمارے کاموں میں برکت نہیں ہوتی -

میں یہ نہیں کہتا کہ ہماری قوم میں نیکی کا خیال نہیں ہے - نہیں ! ان میں بہت کچھ نیکی ہے اور بہت سے نیک کام ان سے ہوتے ہیں - کیسی کیسی عالیشان مسجدیں ، کیسے کیسے عالیشان امام باڑے ، کیسی کیسی نفیس خانقاہیں ان کی نیکی کی یادگاریں موجود ہیں - اب بھی ہر شہر اور ہر قصبے میں دیکھو گے کہ لوگ کس قدر خیرات کرتے ہیں - بھوکوں کو کھلاتے ہیں ، حج و زیارت میں روپیہ خرچ کرتے ہیں ، مسجدیں بنواتے ہیں ، کوئی ایسا کام جس میں ان کی دانست میں مذہبی نیکی ہو دل و جان سے اس میں مصروف ہوتے ہیں . سب لوگ قبول کریں گے کہ اس نیت سے یہ کام کیے جاتے ہیں کہ قیامت میں ان کو اس کا بدلہ ملے گا اور روز حشر میں ان کو ثواب حاصل ہوگا - اگر میرا یہ خیال صحیح ہے تو درحقیقت یہ سب کام خود غرضی اور ذاتی منفعت کے ہیں ، نہ ابنائے جنس کی بھلائی اور قومی ہمدردی کے - جب تک کہ ہمارے دل میں یہ جوش نہ پیدا ہو کہ جو کام ہم کریں وہ قوم کے لیے کریں ، نہ ثواب آخرت کے لیے ، اس وقت تک قومی ہمدردی کا جوش پیدا نہیں ہو سکتا -

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں ان ثواب کے کاموں کو برا جانتا ہوں یا ان کی کچھ حقارت کرتا ہوں ، بلکہ میرا مقصد یہ ہے کہ میں اصلی قومی ہمدردی کو ذہن نشین کرنے میں کوشش کروں اور دوسرے کاموں سے جو امتیاز ہے اس کو بتلاؤں -

الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء)

اسلام میں گداگری کی مذمّت

بھیک مانگنے کی جس قدر مذمت اسلام میں کی گئی ہے، شاید ہی کسی مذہب میں اس کی اس قدر برائی کی گئی ہوگی۔ سوال کے انسداد کو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اس قدر مہتم بالشان تصور فرماتے تھے کہ جس طرح آپ توحید اور نماز پنج گانہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے، اسی طرح لوگوں کو سوال سے باز رکھنے میں ہمت عالی مصروف رکھتے تھے۔ چنانچہ عبدالرحمن رضؓ بن عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے ہم سے فرمایا "کیا تم خدا کے رسول سے بیعت نہیں کرتے؟" ہم نے فوراً ہاتھ بڑھایا، مگر چوں کہ ہم چند ہی روز پہلے بیعت کر چکے تھے، ہم نے عرض کیا "یا رسول اللہ! ہم تو ابھی بیعت کر چکے ہیں، آپ ہم سے کس بات پر بیعت لیتے ہیں؟" آپ نے فرمایا "اس بات پر کہ خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور احکام الٰہی بجا لاؤ" اور پھر آہستہ ارشاد فرمایا "لَا تَسْاءَ لُوا النّاس شَیْئاً" (یعنی لوگوں سے کچھ نہ

مانگو) اس روایت کے بعد عبدالرحمٰنؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد ان لوگوں میں سے (جنھوں نے بیعت کی تھی) بعض کو دیکھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے سواری کی حالت میں کوڑا بھی گر جاتا تھا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں یہ بھی سوال میں داخل نہ ہو، کسی راہ چلتے سے اپنا کوڑا نہ مانگتا تھا۔"

سوال نہ کرنے کی اس قدر تاکید صرف اسی واسطے کی گئی ہے کہ گداگری پیشہ نہ ہو جائے اور اسے آج کل کی طرح ذریعہ معاش نہ بنا لیا جائے۔ کیوں کہ دوسری حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ "ایک دوسرے کی مدد کرو اور اپنے کاموں میں دوسرے بھائیوں سے مشورہ لو" اور جیسے زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ لینے کی حدیثیں ہیں، جیسے اس وقت بعض رقوم کو قوم سے وصول کر کے اسلام کی ضروری خدمات کے صرف کے واسطے بیت المال میں جمع رکھا جاتا تھا، اسی طرح اگر اب بھی قوم کی اہم ضروریات کے واسطے روپیہ فراہم کیا جائے تو یہ گداگری نہیں ہے اور نہ یہ **"لا تساء لوا الناس شیئاً"** میں آ سکتا ہے۔ ورنہ اگر "کچھ نہ مانگو" کے مطلق معنی مراد لیے جائیں تو دنیا کا سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیعت مذکور کا اصل مقصد خاص کر سوال کرنے کی برائی ان کے ذہن نشین کرنی تھی۔ جن باتوں کی تصریح پہلی بیعت میں فرما چکے تھے ان کی تکرار اس موقع پر بطور یاد دہانی کے تھی، نہ کہ اصل مقصود۔ نیز بیعت کرنے والوں کا 'بعد بیعت کے' سوال سے اس قدر بچنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیعت کا اصل مقصد صرف سوال کرنے کی ممانعت تھی اور بس۔

بے شمار روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم سائل سے نہایت نفرت کرتے اور جو شخص بغیر

اضطراری حالت کے سوال کے ذریعے سے کچھ وصول کرتا تھا اس کو اس کے حق میں حرام سمجھتے تھے - جو شخص ایک وقت کی بھی خوراک موجود ہونے پر سوال کرے اس کی نسبت فرماتے کہ "وہ اپنے لیے کثرت سے آتش دوزخ طلب کرتا ہے" -

آں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بار بار فرمایا ہے کہ :

"ہم میں سے جو شخص اپنی رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے اور اس کو فروخت کرے تاکہ خدا تعالیٰ اس کی حاجت رفع کر دے ، یہ اس کے حق میں بہت بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگے ، پھر وہ اس کو کچھ دیں یا دھتکار دیں"

عائذ ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "اگر تم لوگ جانو کہ سوال کرنے کے کیا نتائج ہیں ، تو کوئی شخص سوال کرنے کے لیے دوسرے شخص کی طرف رخ نہ کرے -"

اگر کوئی فلاسفر یا اکانومسٹ (ماہر اقتصادیات) اس مطلب کو بیان کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ :

"جس قدر قوم میں بھیک مانگنے والوں کی کثرت زیادہ ہو جاتی ہے اسی قدر قوم کی دولت میں ، محنت و جفا کشی میں ، غیرت و حمیت میں ، ہمت و اولوالعزمی میں گھاٹا ہوتا جاتا ہے - مفلسوں کو کاہلی اور بے غیرتی کی ترغیب ہوتی ہے اور دولت مندوں کا بہت سا روپیہ ایسی جماعت کی تعداد بڑھانے اور تقویت دینے میں صرف ہوتا ہے جن کا وجود سوسائٹی کے حق میں سَمِّ قاتل کا حکم رکھتا ہے"

مگر جو جامعیت مذکورہ بالا حدیث نبوی میں پائی جاتی ہے ، وہ اس فلاسفر یا اکانومسٹ کے اس لمبے چوڑے بیان میں ہرگز

نہیں پائی جاتی۔

حدیث کے الفاظ جس طرح مذکورہ بالا سوشل (معاشرتی) اور مورل (اخلاق) خرابیوں کو شامل ہیں، اسی طرح ان تمام روحانی آفتوں اور بیماریوں پر حاوی ہیں جو سوال کی مذموم عادت سے سائل کو عارض ہوتی ہیں۔

سائل خدا کو صرف بھیک مانگنے کا ایک اوزار جانتا ہے جس کی نسبت آنحضرت ؐ نے فرمایا ہے کہ "مَلْعُوْنٌ مَنْ سَأَلَ لِوَجْہِ اللّٰہِ"[1]

اس کے دل میں نبی ؐ کی عظمت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ جب خدا کے ساتھ رسول ؐ کا بھی واسطہ دیا جاتا ہے تو ایک مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے۔

سائل اپنے اندوختے کو، جو بھیک کے ذریعے سے اس نے پیدا کیا ہے، چھپاتا ہے اور باوجود استطاعت کے اپنی ناداری کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح کفران نعمت، دروغ گوئی اور مکاری کے سخت ترین گناہوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ گردانتا ہے۔

پس جن جامع الفاظ میں رسول خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھیک مانگنے کی مذمت فرمائی ہے، اس سے زیادہ جامع الفاظ سمجھ میں نہیں آسکتے۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے یعنی یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سوال کرنے پر تو اس قدر لے دے کی ہے کہ بے شمار حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتب احادیث میں موجود ہیں، مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ ادنٰی تأمّل سے معلوم ہو سکتی ہے۔

چوں کہ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنا زیادہ تر سوشل (معاشرتی) خرابیوں کا موجب تھا اور سوال پورا کرنے

۱۔ جس نے اللہ کے نام پر سوال کیا وہ ملعون ہے۔

والوں کی مدح یا ذم تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتی تھی اس لیے رسول خداؐ نے جس صراحت کے ساتھ سوال کی مذمت فرمائی ، ویسی صراحت کے ساتھ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مذمت نہیں فرمائی ۔

بہ ایں ہمہ اگرچہ آپ نے علی الاعلان غیر مستحق سائلوں کا سوال رد کرنے کی تاکید نہیں فرمائی لیکن خود سوال کرنے کی اس قدر مذمت کرنے سے صاف پایا جاتا ہے کہ آپؐ ملک میں سائلوں کی تعداد بڑھنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز سائلوں کی تعداد بڑھانے والی ایسی نہیں ہے جیسے ہر مستحق و غیر مستحق سائل کا سوال پورا کرنا ۔

اس کے سوا متعدد روایتوں کے فحوائے کلام سے پایا جاتا ہے کہ آپ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے سے خوش نہ ہوتے تھے ۔ چنانچہ ابو سعیدرضؓ سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا "قسم ہے خدا کی جو (غیر مستحق) سائل میرے پاس سے اپنا مطلب حاصل کر کے لے جاتا ہے وہ مطلب نہیں ہے اس کے حق میں مگر ایک آگ ۔" یہ سن کر حضرت عمررضؓ نے عرض کیا "آپؐ کیوں اس کا مطلب پورا کرتے ہیں ؟ " آپؐ نے فرمایا "کیا کیا جائے ، لوگ تو مانتے نہیں اور خدا تعالیٰ رد سوال کو مجھ سے پسند نہیں کرتا ۔"

لیکن اس باب میں سب سے عمدہ "مشکوٰۃ"[1] کی وہ حدیث ہے جس میں آنحضرتؐ نے سائل کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے ۔ یعنی انصار میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا ۔ آپ نے پوچھا "کیا تیرے گھر میں کچھ بھی نہیں ؟" اس نے عرض کیا "کیوں نہیں ، ایک موٹی سی کمبلی ہے ، اسے کچھ اوڑھتا ہوں کچھ بچھاتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں " ۔ آپؐ نے فرمایا "دونوں کو

میرے پاس لے آ ۔" وہ دونوں چیزیں لے کر حاضر ہوا ۔ آپ ؐ نے ان کو ہاتھ میں لے کر لوگوں سے فرمایا "ان کو کوئی خریدتا ہے ؟" ایک شخص بولا "میں ایک درہم کو خریدتا ہوں"۔ پھر آپ ؐ نے دو یا تین بار فرمایا "کوئی ایک درہم سے زیادہ دے سکتا ہے ؟" ایک شخص نے کہا "میں دو درہم دیتا ہوں " آپ ؐ نے کمبلی اور پیالہ اسے دے کر دو درہم لے لیے اور اس انصاری سے فرمایا کہ ایک درہم کا تو کھانا لے جا کر اپنے گھر میں پہنچا اور دوسرے درہم کی کلھاڑی خرید کر میرے پاس لا وہ کلھاڑی خرید لایا ۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے ایک لکڑی کا دستہ اس میں ٹھونک دیا اور فرمایا "جا لکڑیاں کاٹ اور بیچ ۔ اب میں تجھ کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں "۔ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بیچنے لگا ۔ پندرہ دن کے بعد جب آنحضرت ؐ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے ۔ اس نے ان میں سے کچھ کا تو کپڑا خریدا اور کچھ سے کھانے کا سامان مول لیا ۔ آپ ؐ نے فرمایا "یہ تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ جب تو قیامت کے دن آئے تو تیرے چہرے پر بھیک مانگنے کا داغ ہو ۔ دیکھ ، سوال کرنا صرف اس شخص کو حلال ہے جو سخت محتاج ہو یا جس کے ذمے بھاری تاوان ہو یا جس کی گردن پر خون بہا ہو "

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، سائل کو سوال کرنے سے روکا جائے اور سوال کرنے کی برائی اور محنت و مشقت کرنے کی خوبی اس کے ذہن نشین کی جائے ۔ مگر اس زمانے کے سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اتنی حد سے گزر گئی ہے کہ کسی کی فہمائش یا ممانعت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا ۔ نظر بہ حالات موجودہ ہم کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ غیر مستحق سائلوں کی داد و دہش سے یک قلم ہاتھ روک لیا جائے

اور جہاں تک ہو سکے مستحقین کی امداد کی جائے جو باوجود استحقاق کے کسی سے سوال نہیں کرتے یا جو سخت مجبوری اور ناداری کی حالت میں سوال کرتے ہیں - غیر مستحق سائلوں کے ساتھ کوئی سلوک اور کوئی بھلائی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ ان کو اس بے غیرتی اور بے شرمی کے پیشے سے باز رکھا جائے -

ملک و قوم کے حق میں کوئی احسان اس وقت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ بھیک مانگنے کا بد ترین پیشہ ، جو مرض متعدی کی طرح افراد قوم میں سرایت کرتا جاتا ہے اور جس سے روز بروز بھک منگوں کی تعداد ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے ، رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جائے -

تاریخ بتاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے بعد مدت دراز تک ممالک اسلامیہ میں سوال کرنا نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا اور طرح طرح سے اس کا انسداد کیا جاتا تھا -

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل کی آواز سنی اور یہ سمجھ کر کہ بھوکا ہے ، اس کو کھانا کھلانے کا حکم دیا - تھوڑی دیر میں اس کی آواز پھر سنائی دی - معلوم ہوا کہ یہ وہی سائل ہے اور کھانا کھانے کے بعد اب پھر مانگتا ہے - آپ نے اس کو بلوایا اور دیکھا کہ اس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی ہے - آپ نے جھولی کا ایک سرا پکڑ کر اس کو اونٹوں کے آگے جھاڑ دیا اور فرمایا "تو سائل نہیں ہے ، تاجر ہے"

علامہ مقرّی تاریخ اندلس میں لکھتے ہیں کہ "اندلس میں جس سائل کو تندرست اور کام کے لائق دیکھتے ہیں ، اس کو نہایت ذلیل کرتے اور سخت سست کہتے ہیں - اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں اپاہج اور معذور آدمی کے سوا کوئی سائل نظر نہیں آتا "-

مگر افسوس اور نہایت ہی افسوس ہے کہ اس زمانے میں ہر ایک جگہ جس قدر مسلمان بھیک مانگتے نظر آتے ہیں ، اس قدر اور کسی قوم کے آدمی نظر نہیں آتے ۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حدود اور اختیارات میں جہاں تک ان کی دسترس ہو ، اس نالائق اور کمینہ رسم کا انسداد کریں ۔

خاص کر ہمارے علماء اور واعظین کو لازم ہے کہ نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ وعظ کی مجلسوں میں سوال کی مذمت ، جو حدیثوں میں وارد ہوئی ہے ، اور جو مضر نتیجے سائلوں کی کثرت سے قوم کے حق میں پیدا ہوتے ہیں اور اسراف اور فضول خرچی کی برائی جو قرآن مجید میں جا بجا بیان ہوئی ہے ، عام مسلمانوں کے ذہن نشین کریں ۔

خاص کر زنانی مجلسوں میں عورتوں کو ، جو ہر فقیر کو مستجاب الدعوات اور اس کی آواز کو غیب کی آواز سمجھتی ہیں ، ان لوگوں کے مکر و فریب سے آگاہ کرنا چاہیے ۔ ان کے دلوں میں بٹھا دیا جائے کہ ہٹے کٹے بھیک مانگنے والوں کو کچھ دینا بجائے نیکی اور بھلائی کرنے کے الٹا گناہ کا مرتکب ہونا ہے ۔ کیوں کہ جس قدر ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے اسی قدر مستحق بیواؤں ، یتیموں اور ہمسایوں کی حق تلفی ہوتی ہے ، اسی قدر بھیک مانگنے کا ناپسندیدہ طریقہ زیادہ رواج پاتا ہے اور اسی قدر قوم میں کام کے آدمیوں کی کمی ہوتی ہے ۔

شبلی نعمانی

(۱۸۵۷ تا ۱۹۱۴)

مسلمانوں کا قدیم طرز تعلیم

۱۴۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو تعلم و تعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرز زندگی کے لیے موزوں تھی ۔ علوم وہ تھے جن کو حافظہ سے زیادہ تر تعلق تھا ۔ بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی ۔ اس دور میں جن علوم کو رواج عام حاصل ہوا وہ نحو ، معانی ، لغت ، فقہ ، اصول ، حدیث ، تاریخ ، اسماءالرجال ، طبقات اور ان کے متعلقات تھے ۔ عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہوگیا تھا مگر رواج عام نہ حاصل کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا اور عام ملک کو کچھ نا واقفیت ، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ و منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی ۔

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے ۔ دیکھو

ٹیگس سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے۔ حجازی فتوحات کا سیلاب اب رک چلا ہے۔ مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے۔ سیکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکل کر دُور دراز ملکوں میں آباد ہوتے جاتے ہیں۔ بہت سی نئی قومیں دلی ذوق سے اسلام کے حلقے میں داخل ہو رہی ہیں لیکن اب تک اس وسیع دنیا میں سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سر رشتہ تعلیم ہے نہ یونیورسٹیاں ہیں، نہ مدرسے ہیں۔ عرب کی نسلیں حکمران ہیں مگر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چنداں نہیں پڑ سکتا۔ تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے۔ ان سب باتوں پر دیکھو کہ علوم و فنون کس تیزی اور وسعت سے بڑھتے جاتے ہیں۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا ہے۔ عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہیں جن میں سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہیں ہے اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید اور فیاض ہیں، اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے ذاتی مکانات ہیں۔ لیکن ان سادہ اور بے تکلّف عمارتوں میں جس وسعت اور فیاضی کے ساتھ علم کی تربیت ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان میں بھی جو پانچویں صدی کے آغاز میں اس غرض سے تعمیر ہوئے اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی۔ اگرچہ اس وقت اس زمانے کا کوئی رجسٹر موجود نہیں جس سے ہم حساب لگا سکیں کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے لیکن تذکرے، تراجم، اسماءالرجال، طبقات کی سیکڑوں، ہزاروں کتابیں موجود ہیں جن سے ہم صحیح اندازے کے قریب پہنچ سکتے ہیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہوں کی بربادی، سپین کی تباہی، تاتار کی عام غارت گری کے بعد ہمارے

پاس جو کچھ رہ گیا ہے وہ ہزار میں ایک بھی نہیں ہے اور اس وجہ سے ہزاروں لاکھوں ناموروں کی صورتیں زمانے کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہیں تاہم ہر عہد میں ہم سیکڑوں ماہرین و مجتہدین فن کا نشان دے سکتے ہیں ۔ صرف ہم عصر و ہم وطن اہل کمال کی فہرست تیار کی جائے تو بھی بہت سی جلدیں تیار ہو سکتی ہیں ۔ ڈاکٹر شپرنگر (SPRENGER) صاحب تخمینہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے اسماء الرجال میں پانچ لاکھ مشہور عالموں کا حال مل سکتا ہے ۔ اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیم یافتہ گروہ میں کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہو سکتا ہے ۔

مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھو ۔ ایک ایک استاد کے حلقہ درس میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں طالب العلم مشغول درس نظر آئیں گے ۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقہ درس ایسے ہوتے تھے جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے ۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتوٰی دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے ۔

اس دور میں تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے یعنی املاء جس کو اُردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں ۔ اُستاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا ۔ طالب العلم جو ہمیشہ قلم و دوات لے کر بیٹھتے تھے ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ہر ایک کی مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی ۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے دُور دراز مسافتوں کا طے کرنا اور متعدد اہل کمال کی خدمت میں پہنچ کر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا ۔ مشہور اہل فن کی لائف چھان ڈالو ۔ اس زمانے میں ایک

مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن میں نامور ہو ، اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے - بغداد ، نیشاپور ، قرطبہ وغیرہ میں گو ہر فن کے کامل شناسا موجود تھے مگر ان شہروں کے رہنے والے بھی مشرق مغرب کی خاک چھانے بغیر نہیں رہتے تھے - علامہ مقرّی کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انھیں علماء کے حالات میں ہے جو سپین سے مصر و شام و بغداد گئے یا ان مقامات سے چل کر سپین میں داخل ہوے - جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لیے ہمیشہ مسلمان سفر کرتے رہے ہیں دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر موجود نہیں ہے -

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لیے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا - مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لیے خاص وقت اور مقام مقرر تھے ، بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے - فقہ ، ادب ، نحو وغیرہ ہر علم کے لیے جداگانہ مجلسیں تھیں - ان میں علماء اور طلبہ دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیے کے لیے انتخاب کیا جاتا تھا - یہ جلسے جن میں زیادہ تر حق پسندی اور انصاف کا استعمال ہوتا تھا ، معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پُر اثر تھے - تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عطا کرتا تھا جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی - اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا جو علماء کا مخصوص لباس تھا -

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے (۱) دینی تعلیم مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی - قرآن و حدیث (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے - اتنے تعلق سے نحو ، صرف ، لغت ، معانی ، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزا تھے - فلسفے نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم

ہونے کی عزت حاصل کی تھی - اس سلسلے نے بڑھتے بڑھتے قریباً ہر علم و فن کو اپنے دائرے میں لے لیا تھا - اب خیال کرو کہ ایک قوم جس میں اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے - جس کی رگوں میں ہنوز عرب کا لہو ہے - جس کی ہمتیں بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہیں اور پیہم ملکی کامیابیوں نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے - جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہوگی تو اسے کس حد تک پہنچا کر رہے گی - عرب کے سوا دوسری قومیں جو اسلام قبول کر چکی تھیں مذہب نے ان کو بھی انھیں سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا جو عرب کے ذاتی خاصے تھے اور چونکہ وہ مدت سے تمدن و معاشرت کی آبادی میں بسر کرتے آئے تھے، تعلیم کے معاملے میں انھوں نے اپنے اُستاد (عرب) سے زیادہ کام دیا ہے - یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا قریباً کل عجمی ہیں، (۲) تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درس گاہوں میں مقید نہ تھی - وزراء، حکام، فوجی افسر، اہل منصب ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے - وزارت کے کثیرالاشغال وقت میں بھی بو علی مینا کی خدمت میں مستعد طلبہ کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا - (۳) تعلیم میں نہایت آزادی تھی - کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی - جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا - اہل کمال کے زمرے میں سیکڑوں گذرے ہیں جو ایک فن میں امام تھے اور دوسرے فنون میں معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہیں رکھتے تھے - (۴) امراء اور اہل منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا - تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا - سلاطین و وزراء تو ایک طرف، معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت میں سیکڑوں ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے اور چونکہ ان کی تنخواہیں کسی خدمت کے

بدل نہ تھیں بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبول عام مہنگے داموں کو خریدا جاتا تھا ، تمام ملک میں لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا - تصنیفات میں زور طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لیے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدر دانوں کے سامنے پیش کرنا ہے وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چیں ہیں -

مدرسوں کے قائم ہونے نے دفعتاً کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی - نصاب تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا - پرائیویٹ تعلیم گاہیں عموماً قائم رہیں اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہیں آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسوں میں خاص خاص قاعدوں کی پابندیاں شروع ہوئیں اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے میں تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا - آٹھویں صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لیے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی ، گو ملکوں کے اعتبار سے مختلف تھی - مثلاً مغرب (مراکو) وغیرہ میں سولہ برس اور ٹیونس میں پانچ برس طالب العلم کو تعلیم گاہ میں رہنا لازمی تھا - املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا - تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو ، صرف ، منطق و امثال ذٰلک ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک بڑا حصّہ انہیں کے نذر ہوگیا اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی - تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا ، اس بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا - پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی - ان مدرسوں میں فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا اور اکثر نامور مدرسوں میں ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی -

انقلابات حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کیے علمی مقاصد کے لیے اکثر مفید ثابت ہوے ایک خاندان گو کلیتاً برباد ہو جاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے - جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی - ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا - تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نہ کر سکا - اس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقّق طوسی کے ہاتھ میں دے جس کا بہت بڑا حصہ محقّق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا - ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکام سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے -

ہم نے اس آرٹیکل میں کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات لکھے ہیں مگر ہم بتا دینا چاہتے ہیں کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے - ہماری علمی فیاضیوں اور ایجادات و صنائع کو مدرسوں کے احاطے سے باہر ڈھونڈنا چاہیے - مدرسوں کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی تعداد کو کم نہیں کیا - ۷۴۸ھ میں جب کہ مصر مدرسوں اور دارالعلوم سے معمور تھا خود مصر کی ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے -

میں نے اس آرٹیکل میں اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب و تاب سے لکھوں - قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا ہے یہ بھی اس کے چہرے پر نہیں کھلتا - سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کر سکتے ہیں - ہم نے جب خود کچھ نہیں کیا تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا -

عبدالحق

(۱۸۷۰ء تا ۱۹۶۱ء)

قائد اعظم اور اردو

میں سیاسی تحریکوں سے ہمیشہ الگ رہا - اگرچہ انڈین نیشنل کانگرس ، مسلم لیگ ، خلافت وغیرہ میرے سامنے وجود میں آئیں اور ان کے ہنگامے بھی دیکھے ، لیکن ان میں سے کسی جماعت سے کبھی سروکار نہ رکھا - ایک تو اس لیے کہ میں سلسلہ ملازمت میں تھا ، دوسرے میں اس کا اہل بھی نہیں - قائد اعظم محمد علی جناح[1] سیاست اور قانون کے مرد میدان تھے - ان سے ملنے جلنے یا بات چیت کا شرف انھیں کو حاصل ہو سکتا تھا جو سیاست یا قانون سے تعلق رکھتے تھے - اس لیے مجھے کبھی ان سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا -

۱۹۳۷ میں شملے سے ان کا ایک خط میرے نام آیا ، جس کا مضمون یہ تھا کہ مجھے یہ معلوم کر کے مسرت ہوئی کہ آپ قومی کام کر رہے ہیں - میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں - ان دنوں لکھنئو میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا ہے - اگر آپ وہاں آ کر مجھ سے ملیں تو ممنون ہوں گا - اس کے ایک دو روز بعد ہی علامہ ڈاکٹر اقبال[2] اور میاں بشیر احمد بیرسٹر ایٹ لاء مدیر "ہمایوں" کے خط آئے ، جن میں بہ تاکید لکھا گیا تھا کہ میں ضرور مسٹر جناح سے ملوں -

میرا قیاس یہ ہے کہ ملاقات کی یہ تحریک ڈاکٹر اقبالؒ نے کی ہوگی۔ ان کو شاید اندیشہ تھا کہ میں اہل کانگرس یا ہندی والوں سے کوئی سمجھوتہ نہ کر لوں جو اردو کے حق میں مفید نہ ہو۔ اتفاق سے انھیں دنوں میرے مہربان عبدالرحمان صدیقی صاحب حیدر آباد میں میرے مہمان تھے۔ وہ مسلم لیگ کونسل کے ممبر تھے اور اس کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے آئے تھے۔ ان کی رفاقت مجھے بہت غنیمت معلوم ہوئی۔ روانگی سے پہلے بعض احباب کے مشورے سے ہم نے ایک ریزولیوشن بھی اردو کے متعلق تیار کر لیا تھا، جو ہم مسلم لیگ کی کونسل میں پیش کرنا چاہتے تھے۔

لکھنؤ پہنچ کر میں صدیقی صاحب کے ہمراہ مسٹر جناحؒ سے ملا۔ انھوں نے سلام علیک کے بعد پہلا سوال یہ کیا کہ آپ ہم سے تعاون کیوں نہیں کرتے؟ میں نے کہا کہ آپ کچھ کر ہی نہیں رہے تو تعاون کس سے کروں (میرا اشارہ اردو کے متعلق تھا) فرمایا آئندہ ہم کریں گے، تو میں نے کہا میں ضرور تعاون کروں گا۔ پھر میں نے ریزولیوشن کا مسودہ ان کے ملاحظہ کے لیے پیش کیا، جسے انھوں نے شروع سے آخر تک پڑھا اور پسند فرمایا۔

دوسرے روز کونسل کا اجلاس تھا۔ میں نہ تو لیگ کا ممبر تھا نہ کونسل کا، اس لیے کوئی ریزولیوشن پیش نہ کر سکتا تھا۔ اس کام کو عبدالرحمان صدیقی صاحب نے اپنے ذمے لیا۔ میں بھی کونسل کے اجلاس میں تماشا دیکھنے گیا کہ اس ریزولیوشن کا کیا حشر ہوتا ہے۔ ارکان کونسل میرے پاس آ بیٹھے اور کہنے لگے کہ اب کے آپ کلکتہ ضرور آئیے، ہم اردو کی اشاعت و ترویج میں پوری مدد دیں گے، اب پہلے سی حالت نہیں رہی ہے، وہاں کے لوگ اردو کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ اس قسم کی باتیں کر رہے تھے، ادھر اردو کا ریزولیوشن پیش ہو رہا تھا۔ جب صدیقی صاحب نے ریزولیوشن کا یہ آخری فقرہ پڑھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ

کی آفیشل (کاروباری) زبان اردو ہو گی ''تو یہ بنگالی حضرات پھر سے اڑ کر میدان میں جا پہنچے اور مولانا اکرم خان نے نہایت فصیح اور پر جوش اردو زبان میں اس کی مخالفت کی - اس کے جواب میں بنگال کے دوسرے مشہور صاحب بدرالدجی نے اپنی لچھے دار انگریزی تقریر میں ریزولیوشن کی تائید کی - اب موافقت اور مخالفت کا ہنگامہ برپا ہو گیا - جب بات بہت بڑھی تو نواب اسمٰعیل خان میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر ہم ریزولیوشن کو یوں بدل دیں کہ ''ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو آل انڈیا مسلم لیگ کی آفیشل زبان ہو۔'' میں نے کہا ''کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آل انڈیا نیشنل کانگرس تو یہ کہے کہ ہماری زبان ہندوستانی ہو گی اور ہم اب تک کوشش ہی کے چکر میں ہیں - جس کے یہ معنی ہیں کہ کچھ بھی نہ ہو گا -'' اگرچہ کثرت رائے ہمارے ساتھ تھی لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ قرار داد کثرت رائے سے منظور ہو - بالاتفاق منظور ہونی چاہیے تھی - جب میں نے دیکھا کہ جھگڑا بڑھتا ہی جاتا ہے تو میں نے صدیقی صاحب سے کہا ریزولیوشن واپس لے لیجئے - انھوں نے اس کا اعلان کیا تو ہر طرف سے ''نہیں نہیں''، '' نو نو'' کی آوازیں آنے لگیں - اس کے بعد نواب اسمٰعیل خان پھر میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اگر یوں بدل دیں تو آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو گا - ''ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو تمام ہندوستان کی عام زبان ہو جائے'' - میں خاموش ہو رہا کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا -

۱۹۳۹ء میں انجمن دہلی منتقل ہو گئی - اتفاق دیکھیے کہ کچھ دنوں بعد قائد اعظم بھی دلی میں آئے، لیکن بہت دنوں تک ملاقات کا اتفاق نہ ہوا - ۱۹۴۵ء میں مولوی سید ہاشمی صاحب کو خیال آیا کہ انھیں انجمن میں بلانا چاہیے - چنانچہ ان کے لکھنے پر انھوں نے بڑی خوشی سے انجمن میں قدم رنجہ فرمایا اور ہمارے ساتھ

طرف سے شور و غل ہوا - "اردو ، اردو" - اس سے مجبور ہو کر انھوں نے کچھ جملے اردو میں ارشاد فرمائے ، اس کے بعد پھر اپنی محبوب زبان انگریزی میں بولنے لگے - اس پر "اردو ، اردو" کا شور و غل ہوا - تب آپ نے جل کر فرمایا کہ مسٹر جناحؒ بھی انگریزی میں تقریر کرتے ہیں - یہ سن کر قائد اعظمؒ اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صریح اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ "سر فیروز خان نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے لہٰذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو ہو گی -" اس پر تمام حاضرین نے بڑے جوش سے تالیاں بجائیں - افسوس کہ اس کونسل کی جو روئیداد اخباروں میں چھپی اس میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا گیا - اخبار والوں کی نظر میں شاید معمولی سی بات تھی ، لیکن ہمارے لیے یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے -

فروری ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقی اردو کی سالانہ کانفرنس بمبئی میں ہوئی - یہ کانفرنس بڑی شان سے ہوئی اور اہل بمبئی نے انجمن کے عمارت فنڈ میں بھی کافی امداد کی - کانفرنس میں جب قائد اعظمؒ کا ہمت افزا پیغام پڑھ کر سنایا گیا تو حاضرین نے خوشی کے نعرے لگائے اور اس جوش سے تالیاں بجائیں کہ سارا پنڈال گونج اٹھا - دوسرے روز میں قائد اعظمؒ سے ان کے مکان پر ملنے گیا - اگرچہ اس وقت انھیں بخار تھا ، پھر بھی وہ نیچے آ کر مجھ سے ملے اور کچھ دیر تک کانفرنس ور اردو کے متعلق باتیں کرتے رہے -

انجمن نے حکومت ہند سے نئی دہلی میں اپنی عمارت کے لیے ایک قطعہ اراضی خریدا تھا ، اس کے لیے میں جگہ جگہ چندہ جمع کر رہا تھا - جنگ کی وجہ سے عمارت کا تخمینہ کئی گنا بڑھ گیا تھا - توقع تھی کہ حکومت نظام سے ہمیں اس کے لیے بہت اچھا عطیہ ملے گا - چنانچہ اس غرض سے ایک عرضداشت مرتب کی گئی جو سر تیج

بہادر سپرو صدر انجمن کی طرف سے پیش کی جانے والی تھی۔ اس ضمن میں مَیں قائد اعظمؒ سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ کرنل (ڈاکٹر) عبدالرحمان بھی ان سے ملنے والے تھے۔ انھوں نے ملاقات کا وقت دریافت کیا اور میرا نام بھی لیا اور کہا کہ وہ بھی آنا چاہتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کل آئیے اور لنچ میرے ساتھ کھائیے۔ دوسرے دن ہم گئے دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اس اثنا میں میں نے یہ عرض کی کہ انجمن کو عمارت کے لیے کافی رقم کی ضرورت ہے، عطیے کی ہمیں سب سے بڑی امید دولت سرکار عالی حیدر آباد دکن سے ہے۔ عرضداشت سر تیج بہادر سپرو کی طرف سے پیش کی جائے گی، اگر آپ ایک خط اعلیٰ حضرت حضور نظام کے نام عنایت فرمائیں تو منظوری میں بڑی آسانی ہو جائے گی۔ فرمایا کہ میں خط لکھنا مناسب خیال نہیں کرتا۔ لوگوں نے پہلے ہی مجھے بدنام کر رکھا ہے کہ حضور نظام مجھے چھے لاکھ روپے سالانہ دیتے ہیں، آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ میں نے کہا اخباروں میں تو پڑھا ہی تھا، لیکن تعجب یہ ہے کہ "موڈرن ریویو" جو ایک ادبی رسالہ ہے، اس نے بھی یہ خبر شائع کی ہے۔ کہنے لگے خط تو میں نہیں لکھوں گا، لیکن حیدر آباد عنقریب جانے والا ہوں اس وقت میں بالمشافہہ اعلیٰ حضرت سے امداد کے لیے کہوں گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کانگرس اور مسلم لیگ میں سیاسی الجھنیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور ہر روز کوئی نہ کوئی نیا شگوفہ کھلتا تھا۔ اس وقت قائداعظمؒ کی مصروفیت انتہا کو پہنچ چکی تھی اور دن رات میں کوئی ایسا وقت نہ تھا جو ان الجھنوں سے خالی ہو۔ ادھر اعلیٰ حضرت حضور نظام کا تقاضے پر تقاضا تھا کہ جلد آؤ، خط پر خط اور تار پر تار چلے آ رہے تھے۔ آخر خدا خدا کر کے وہ دن آیا کہ قائد اعظمؒ نے حیدر آباد کی روانگی مقرر کی۔ جب مجھے تاریخ کا علم ہوا تو میں کئی روز پہلے حیدر آباد جا پہنچا۔

حیدر آباد کا بڑا ہوائی اڈا شہر سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے

پر ہے - لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ہزار ہا آدمی گاڑیوں
میں ، موٹروں میں اور پیدل ہوائی اڈے کی طرف جا رہے تھے اور
ہزاروں دو طرفہ سڑک پر ان کے انتظار میں کھڑے تھے - جہاز کے
آنے میں دیر ہوئی ، کیونکہ گوالیار سے بوجہ کثرت بارش وقت پر نہ
چل سکا - جس وقت جہاز نظر آیا تو لوگوں نے خوشی کے نعرے
لگائے ، جوں ہی زمین پر اترا لوگ اس پر ٹوٹ کر گرے - قائد اعظمؒ
اتر ہی رہے تھے کہ جب انہوں نے یہ عالم دیکھا - بہت خفا ہوے
اور پھر اندر جا بیٹھے - لوگوں کو ہٹا کر راستہ صاف کیا گیا -
اب پھر اترنے والے تھے کہ لوگ بے تحاشا ادھر دوڑ پڑے - ادھر
سے دو انگریز پٹرول گاڑی لے کر جا رہے تھے - انہوں نے گاڑی
ٹھہرا کر قائد اعظمؒ کو بٹھا لیا - اس کی طرف بھی لوگ دوڑے اور
بعض نوجوان گاڑی پر چڑھنے لگے - بڑی مشکل سے مار کر انہیں
ہٹایا - غرض وہ انگریز انہیں ہجوم میں سے نکال کر لے گئے - جو
سرکاری موٹر ان کے لیے آئی تھی ، وہ پیچھے پیچھے گئی اور کچھ
دور چلنے کے بعد اس میں بٹھا کر سرکاری مہمان خانے میں جا پہنچایا
دوسرے دن قائد اعظمؒ اعلیٰ حضرت کی ملاقات کو گئے - جب وہاں
سے واپس آئے تو میں ملنے گیا - ملاقات کا حال سنایا تو مجھے نہایت
افسوس ہوا ، اور جو بڑی بڑی امیدیں وہاں لے کر گیا تھا ، وہ
خاک میں مل گئیں -

اس کے دوسرے دن سہ پہر کو دارالسلام میں قائد اعظمؒ کی
تقریر تھی ، تقریباً ایک لاکھ کا مجمع تھا - سارا صحن اور ہال بھرا
ہوا تھا اور بہت سے لوگ درختوں اور چھتوں پر جا بیٹھے تھے -
قائد اعظمؒ نے بہت صاف اور اچھی اردو زبان میں تقریر کی - یہ تقریباً
پینتالیس منٹ تک رہی - اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں تقریر
فرمائی - یہ بہت معرکہ آرا تقریر تھی ، خاص کر حیدر آباد کے لیے -
دوسرے دن مولوی نقی الدین صاحب (سیکرٹری گورنمنٹ نظام) کے

ہاں دعوت تھی - دسترخوان پر میں قائد اعظمؒ کے پاس بیٹھا تھا - میں نے مبارک باد دی کہ آپ نے ایسی اچھی اردو میں تقریر کی - مجھے اس کی ہرگز توقع نہ تھی - فرمانے لگے : "آپ اردو کے استاد (ماسٹر) ہیں" - میں نے کہا اب آپ کبھی یہ نہ کہیے گا کہ میری اردو "تانگہ والی اردو ہے" - اس پر وہ مسکرائے -

۱۹۴۷ء کے وسط میں تقسیم ملک کے بعد حالات کا نقشہ ہی بدل گیا اور جو جو المناک حادثات اور واقعات گزرے ، وہ ابھی تازہ ہیں ، ان کے بیان کی ضرورت نہیں - انجمن کو بھی اس میں بہت کچھ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا اور بہت سی عزیز یادگاریں اور قیمتی مسودے تلف ہو گئے -

جب سندھ حکومت کی عنایت سے انجمن کو ایک مناسب اور اچھی عمارت مل گئی اور ہم نے کام کا ڈول ڈالا تو قائد اعظمؒ سے درخواست کی کہ وہ اس کا افتتاح فرمائیں - انھوں نے جواب میں لکھا کہ "میں بہت خوشی سے اس کا افتتاح کروں گا اور ضرور کروں گا - ، اس وقت بہت مصروف ہوں ، سرحد کے دورے سے واپسی پر وسط اپریل ۱۹۴۸ء کے بعد کسی تاریخ کو افتتاح کی رسم ادا کروں گا -" پھر معلوم ہوا کہ غالباً ۳ مئی کے لگ بھگ کوئی تاریخ مقرر کی جائے گی ، لیکن کام کی کثرت اور ناسازیِ مزاج کی وجہ سے پروگرام جلد جلد بدلتا رہا اور اس کا موقع نہ آیا - کوئٹہ کی روانگی سے کچھ دیر قبل انھوں نے فون سے معذرت کی کہ ہجوم کار اور بعض دوسرے حالات کی وجہ سے میں افتتاح کرنے سے قاصر ہوں - کوئٹے کے دورے میں کم سے کم پانچ ہفتے لگیں گے - آپ اس اثناء میں کسی اور سے افتتاح کرا لیجیئے - مگر میں کسی دوسرے موقع پر انجمن میں ضرور آؤں گا - کوئٹے سے وہ کراچی میں آئے ، لیکن ایسے آئے کہ وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے -

———

فرحت اللہ بیگ

(۱۸۸۳ء تا ۱۹۴۷ء)

مردہ بدست زندہ

زمانے نے خلوص دلوں سے مٹا دیا ہے۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ نہ اب جینے میں کوئی سچے دل سے کسی کا ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک دلی درد کے ساتھ جاتا ہے۔ غرض دنیا داری رہ گئی ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی مرتا تھا تو ایسا رنج ہوتا تھا گویا اپنا عزیز مر گیا ہے۔ اب کوئی اپنا بھی مر جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر مر گیا۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب رسماً رہ گیا ہے۔ صرف اس لیے چلے جاتے ہیں کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ "واہ جیتے جی تو دوستی و محبت کا دم بھرا جاتا تھا۔ مرنے کے بعد پھر کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا" اب رہی دل کی حالت تو اس کا بس خدا ہی مالک ہے۔ آئیے میرے ساتھ آئیے۔ آج کل کی میتوں کا رنگ بھی دکھا دوں۔

یہ لیجیے سامنے ہی کے مکان میں کسی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ کوئی بڑے شخص ہیں۔ سیکڑوں آدمی جمع ہیں موٹریں بھی ہیں۔ گاڑیاں بھی ہیں۔ غریب بھی ہیں امیر بھی ہیں۔ بیچارے غریب تو اندر جا بیٹھے ہیں۔ کچھ پڑھ بھی رہے ہیں۔ جتنے امیر

ہیں وہ یا تو اپنی اپنی سواریوں میں بیٹھے ہیں یا دروازے پر کھڑے
سگریٹ پی رہے ہیں ۔ جو غریب آتا ہے وہ سلام کرتا ہوا ادھر چلا
جاتا ہے ۔ جو امیر آتا ہے وہ ان باہر والوں ہی میں مل کر کھڑا
ہو جاتا ہے ۔ پہلا سوال یہی ہوتا ہے "کیا مر گئے ؟ بھئی ہمارے
تو بڑے دوست تھے" ۔ اتنا کہا اور اپنی جیب سے سگریٹ کا بکس
یا پانوں کی ڈبیا نکالی ۔ لیجیے تعزیت ختم ہوئی اور رنج دلی کا اظہار
ہو چکا ۔ اب دنیا بھر کے قصے چھڑے ۔ ایک دوسرے سے نہ ملنے
کی شکایت ہوئی ۔ دفتر کی کارروائیاں دریافت کی گئیں ۔ ملک کی
خبروں پر رائے زنی ہوئی ۔ غرض اس بات چیت کا یہاں تک سلسلہ
کھنچا کہ مکان سے جنازہ نکل آیا ۔ یہ دیکھتے ہی دروازے کی بھیڑ
چھٹ گئی ۔ کچھ ادھر ہوگئے کچھ اُدھر ۔ آگے آگے جنازہ ہے ۔
اس کے پیچھے پیچھے یہ سب لوگ ہیں ۔ ابھی چند قدم ہی
چلے ہوں گے کہ ان ساتھ والوں میں تقسیم ہونی شروع ہوئی
اور چپ چاپ اس طرح ہوئی کہ کسی کو معلوم بھی نہ ہوا کہ کب
ہوئی اور کیونکر ہوئی ۔ جن کو پیچھے رہنا تھا انھوں نے چال
آہستہ کر دی ۔ جنھیں ساتھ جانا تھا وہ ذرا تیز چلے ۔ غرض ہوتے
ہوتے یہ ساتھ والے تین حصوں میں بٹ گئے ۔ آگے تو وہ رہے
جو مرنے والے کے عزیز تھے ۔ اس کے پیچھے وہ لوگ رہے جن کے
پاس یا تو سواریاں نہ تھیں ۔ یا شرما شرمی پیدل ہی جانا مناسب
سمجھتے تھے ۔ آخر میں وہ طبقہ ہوا جو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹتا
ہٹاتا اپنی سواریوں تک پہنچ گیا اور ان میں سوار ہوگیا ۔ اگر
پیدل چلنے والوں میں کوئی عہدہ دار ہیں تو غرض مندوں سے
ان کو یہاں بھی چھٹکارا نہیں ۔ ایک آیا ۔ جھک کر سلام کیا ۔ گھر
بھر کی مزاج پرسی کی ۔ مرنے والے کے کچھ واقعات بیان کیے ۔
اگر ڈاکٹر کا علاج تھا تو ڈاکٹری کی برائیاں کیں ۔ اگر حکیم کے
علاج سے مرا ہے تو طبابت کی خرابیاں ظاہر کیں ۔ اور اسی سلسلے

میں اپنے واقعات بھی بیان کر گئے - ان سے پیچھا نہ چھٹا تھا کہ دوسرے صاحب آ گئے اور انھوں نے بھی وہی دنیا بھر کے قصے شروع کیے - غرض اسی طرح جوڑی بدلتے بدلتے مسجد تک پہنچ ہی گئے - یہاں ہمراہیوں کی پھر تقسیم ہوتی ہے - ایک تو وہ ہیں جو ہمیشہ نماز پڑھتے ہیں اور اب بھی پڑھیں گے اور دوسرے وہ ہیں جو نہا دھو کپڑے بدل کر اسی جنازہ کے لیے آئے ہیں - تیسرے وہ ہیں جو اپنی وضع داری پر قائم ہیں - یعنی نماز نہ کبھی پڑھی ہے اور نہ اب پڑھیں گے - دور سے مسجد کو دیکھا اور انھوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا - جنازہ مسجد تک پہنچا بھی نہ تھا کہ ان کو کسی دیوار کسی موٹر یا کسی گاڑی کی آڑ مل گئی - یہ وہیں کھڑے ہوگئے اور سگریٹ پی کر یا پان کھا کر انھوں نے وقت گزار دیا - ہاں اس بات کا انتظام رکھا کہ نماز ختم ہونے کی اطلاع فوراً مل جائے - ادھر نماز ختم ہوئی ادھر یہ لوگ مسجد کے دروازے کی طرف بڑھے ادھر جنازہ نکلا ادھر یہ پہنچے - بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی نماز پڑھ کر مسجد ہی سے نکل رہے ہیں -

یہ تو ساتھ والوں کا حال ہوا - اب راستہ والوں کی سنیے - اگر میّت کے ساتھ صرف دو چار آدمی ہیں تو کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جیا کون مرا - اگر جنازے کے ساتھ بڑے بڑے لوگ ہوے تو دکان والے ہیں کہ ننگے پاؤں بھاگے چلے آ رہے ہیں - آئے، مرنے والے کا نام پوچھا، مرض دریافت کیا اور واپس ہوے گویا میونسپل کمیٹی نے رجسٹر حیات و ممات ان ہی کے تفویض کر دیا ہے اور یہ صرف اس لیے نام پوچھنے آئے تھے کہ رجسٹر میں سے مرنے والے کا نام خارج کر دیں - موٹر نشینوں کی کچھ نہ پوچھو - یہ تو سمجھتے ہیں کہ سڑکیں انھی کے لیے بنی ہیں کسی جنازہ کا سڑک پر سے گزرنا ان کو زہر معلوم ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ رفتار کم ہونے سے پٹرول

کا نقصان ہے - کسی کو کیا حق ہے کہ مر کر ان کے پٹرول کا نقصان کرے - خیر کسی نہ کسی طرح یہ تمام مصیبتیں اٹھا کر جنازہ قبرستان میں پہنچ ہی گیا- قبرستان کی حالت پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے - جاے عبرت کو جاے وحشت بنا دیا ہے - قبرستان کیا ہے خاصہ ایک جنگل ہے - ایک طرف ٹوٹی پھوٹی ایک جھونپڑی پڑی ہے - اس میں ایک سقے صاحب - ان کی بیوی دس بارہ بچے - پانچ چھے بکریاں - ایک لنگڑا ٹٹو - سو دو سو مرغیاں - پانچ چھیلیاں اور خدا معلوم کیا کیا بلیّات بھرے پڑے ہیں - جس حصے میں قبریں ہیں وہاں کی گھاس بڑھ کر کمر کمر ہوگئی ہے - دیواروں کو توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لیے ہیں - نیم ، پیپل اور خدا معلوم کس کس قسم کے درخت قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ توڑ کر نکل آئے ہیں - کوئی قبر دھنس کر کنواں بن گئی ہے - کسی کا تعویذ ہی غائب ہے - کسی چبوترے کی اینٹیں نکل کر جھونپڑی میں خرچ ہوگئی ہیں - غرض کس مپرسی نے اس حصے کی عجیب حالت کر دی ہے -

میاں سقے رہتے تو قبرستان میں ہیں مگر ہمیشہ پھولوں کی سیج پر سوتے ہیں - ادھر لوگ قبر پر پھول چڑھا کر گئے اور ادھر ان کے بچے سب کے سب سمیٹ لائے - رات بھر یہ پھول بستر پر رہے - صبح باسی پھول لے جا کر پھر قبر پر چڑھا دیے - خیر کیا حرج ہے ؟ زندوں کا کام بھی نکل گیا - مردے بھی خوش ہوگئے - اس گھر میں سل بٹا خریدنے کی کبھی نوبت نہیں آئی - قبر کے اچھے سے اچھے پتھر پر مصالحہ پیس لیا - اگر کچھ دنوں کوئی دیکھنے بھالنے نہ آیا تو پتھر اکھاڑ جھونپڑی کے پاس لا رکھا - بکریاں قبروں پر قلانچیں مارتی پھرتی ہیں - مرغیاں کچی قبروں کو کرید رہی ہیں - بچے یا تو چبوتروں پر لوٹ مار رہے ہیں یا تعویذوں کو گھوڑا بنائے بیٹھے ہیں - کسی بیچارے کی قبر پر چادر پڑی ہے اس پر بی سقنی نے

گیہوں سکھانے ڈال دیے ہیں - ٹٹوانی کو ایک اگلی اور ایک پچھلی ٹانگ باندھ کر چھوڑ دیا ہے - وہ قبروں میں گھاس چرتی پھرتی ہیں ان کے ادھر اُدھر پھدکنے سے کسی قبر کی اینٹ گری - کسی کا چونا گرا - کسی کا پتھر گرا - اگر ایسے ہی چار پانچ گھوڑے چھوڑ دیے جائیں تو تھوڑے ہی دنوں میں وہی منظر بن جائے جو زلزلے کے بعد کانگڑے کا ہوگیا تھا -

یہ تو قبرستان والوں کی حالت ہوئی - اب ساتھ والوں کی کیفیت سنیے - جنازہ لا کر لب گور رکھ دیا گیا - ایک آتا ہے قبر کو جھانک جاتا ہے - دوسرا آتا ہے جھانک جاتا ہے - ہر شخص کو زمین سخت ہونے کی شکایت ہے - کوئی مزدوروں کو سست کہتا ہے - کوئی پٹاؤ کا نقص بتاتا ہے - کوئی قبرستان والے کو برا کہتا ہے - جب اس ریویو سے بھی فراغت پائی تو دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھے - چبوترے کو تخت بنایا اور تعویذ کو گاؤ تکیہ اور لگے سگریٹ اور بیڑی کا دم لگانے - یہ توفیق نہیں ہوتی کہ کچھ خدا کی یاد کریں - یا ان خفتگان خاک کی حالت کو دیکھ کر عبرت ہی حاصل کریں -

بعض لوگ ہیں کہ گھاس سے بچتے بچاتے قبروں پر کودتے پھاندتے چلے جا رہے ہیں - یہ کون ہیں ؟ یہ وہ صاحب ہیں جن کے مرے ہوے عزیزوں کے آج دن پھرے ہیں - یوں تو خدا نخواستہ فاتحہ کو کیوں آنے لگے - آج شرما شرمی قبرستان آئے ہیں - مفت کوم داشتن کی صورت ہے - چلو فاتحہ بھی پڑھ لیتے ہیں - اس کے بعد جب کوئی دوسرا عزیز یا دوست مرے گا تو پھر دیکھا جائے گا -

ایک صاحب ہیں کہ قبروں کے کتبے ہی پڑھتے پھر رہے ہیں کچھ نوٹ بھی کرتے جاتے ہیں - کوئی اچھا کتبہ مل گیا تو اپنے

دوستوں کو بھی آواز دے کر بلا لیا اور بجائے فاتحہ کے داد سخن گوئی دی گئی ۔ کچھ اپنا کلام سنایا گیا ۔ کچھ ان کا سنا ۔ غرض کوئی نہ کوئی مشغلہ وقت گزارنے کا نکال لیا ۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں ان کی کچھ نہ پوچھو ۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک اجلاس ۔ دنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے ۔ دفتر کی کارروائیوں کی بحث ہو رہی ہے ۔ افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جارہی ہے ۔ سفارشیں ہو رہی ہیں ۔ وعدے لیے جا رہے ہیں ۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے ۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں ۔

خیر خدا خدا کر کے خبر آئی کہ قبر تیار ہے ۔ کچھ تو اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے ۔ کچھ وہیں بیٹھے رہ گئے ۔ ایک صاحب نے قبر میں اتر کر گلاب اور عود چھڑکا ۔ ایک نے میّت کے اوپر کی چادر سمیٹی چادر میں بل دیے ۔ دو صاحبوں نے مُنھے کے سرے پکڑ کر میت کو اٹھایا ۔ آٹھ دس نے غل مچایا سنبھال کے ۔ سنبھال کے ۔ میت بھاری ہے ۔ کمر کے نیچے چادر دو ۔ ارے میاں اپنی طرف گھسیٹو ۔ ہاں آہستہ سے آہستہ سے" اب میت قبر کے منہ تک آ گئی اور قبر کے گرد جو لوگ کھڑے تھے انھوں نے بے تحاشا غل مچانا شروع کیا ۔ کوئی کہتا ہے " ذرا کمر کی چادر کھینچو ۔ ارے بھئی اتنا بھی دم نہیں ہے ۔ دیکھنا کہیں قبر کا پاکھا نہ گرے ۔ ہاں ہاں ۔ ذرا اور جھکا کر ۔ لا الہ الا اللہ ۔ میت بھاری ہے ۔ ذرا سنبھال کے آہستہ آہستہ ۔ "بس بھئی بس" ۔ کوئی چیخ رہا ہے " مٹھے کے بندھن کھول دو ۔ ارے میاں لو ۔ یہ ڈھیلا لو ۔ سر کے نیچے رکھ کر منہ قبلہ کی طرف تو کر دو ۔ واہ بھئی واہ ۔ اتنا بھی نہیں آتا ۔ ابھی منہ پورا نہیں پھرا ۔ بس بھئی بس ۔"

یہ مختلف فقرے ایک کی زبان سے نہیں نکلتے کہ کچھ سمجھ میں بھی آئے۔ ہر شخص ہے کہ غل مچا رہا ہے جو بیچارے قبر میں اترے ہیں وہ پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں بہرحال اس غل غپاڑے کے ساتھ دوست و احباب اس مرنے والے کو پہلی منزل تک پہنچا دیتے ہیں - اب پٹاؤ کی نوبت آتی ہے - اس میں بھی وہی گڑبڑ شروع ہوتی ہے - کوئی کہتا ہے "یہ کڑی نہیں وہ کڑی لو -" کوئی کہتا ہے لا حول ولا قوۃ - مفت میں سو روپے مار لیے اور کڑیاں دیں تو ایسی - غرض کوئی کچھ کہتا ہے - کوئی کچھ اور اسی گڑبڑ میں پٹاؤ بھی ہو جاتا ہے اور مٹی دینے کی نوبت آتی ہے - مٹی تو ہر ایک دیتا ہے - منہ سے بھی ہر ایک بڑبڑاتا ہے - لیکن یہ خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو پڑھنا چاہیے وہ پڑھتا بھی ہے یا نہیں - البتہ لفظ " منہا " بہت اونچی آواز میں کہا جاتا ہے اور باقی سب الفاظ منہ ہی منہ میں ختم کر دیے جاتے ہیں - جب اس کام سے فراغت پائی اور قبر تیار ہوگئی تو فاتحہ کی نوبت آئی - ساتھ آنے والوں میں کوئی بھی ایسا نہ ہوگا جو اس میں شریک نہ ہو ہونٹ تو سب کے ہلتے ہیں مگر شاید سو میں بیس بھی نہ ہوں گے جو یہ جانتے ہوں کہ فاتحہ میں کیا کیا سورتیں پڑھتے ہیں - فاتحہ پڑھتے ہی سب کو اپنے اپنے گھر جانے کی سوجھی - یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ مرنے والے کے اعزہ کون ہیں اور ان کی کیا حالت ہے -

دیکھ لیا آپ نے اس زمانہ کی میت کا رنگ - جو میں نے عرض کیا تھا وہ صحیح نکلا یا نہیں ؟ اب سوائے اس کے کیا کہوں کہ خدا سے دعا کی جائے کہ اللہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے - ان کے دل میں درد پیدا کرے - یہ سمجھیں کہ احکام کیا ہیں ؟ اور ہم کیا کر رہے ہیں -

---

ملّا واحدی

(۱۸۸۸ء تا ۱۹۷۶ء)

سرورِ کائنات ؐ کی معاشرت، عادات و معمولات

ایک مرتبہ حضرت امام حسین ؑ نے حضرت علی مرتضیٰ ؑ سے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عادات و خصائل دریافت کیے ۔ حضرت علی ؑ نے فرمایا : حضور ؐ خندہ جبیں ، نرم خو اور مہربان طبع اور فیاض تھے ۔ کبھی کوئی برا کلمہ حضور ؐ کی زبان پر نہیں آتا تھا ۔ نتیجہ خیز اور کارآمد باتیں کیا کرتے تھے ۔ فضول بولنا اور ضرورت سے زیادہ بولنا یا بحث مباحثے میں پڑنا حضور ؐ سے ہمیشہ بعید رہا ۔ کبھی کسی کو برا بھلا نہیں کہتے تھے ۔ کبھی کسی کے اندرونی حالات کی ٹوہ نہیں لگاتے تھے ۔ دوسرا بولنے لگتا تو اسے دل کھول کر بولنے دیتے تھے ۔ اس کی بات درمیان میں نہیں کاٹتے تھے ۔ کوئی بیباک گستاخانہ گفتگو کرتا تو حضور ؐ کا تحمل دیکھنے کے قابل ہوتا تھا ۔ کوئی کسی احسان کا شکریہ ادا کرتا تو سن لیتے ۔ لیکن اپنی تعریفیں سننی پسند نہیں فرماتے تھے ۔ لوگ باتیں کرتے کرتے ہنستے تو حضور ؐ بھی مسکرا دیتے تھے اور لوگ کسی امر پر حیرت کا اظہار کرتے تو حضور ؐ ان کے ساتھ اظہار حیرت میں شریک ہو جاتے تھے ۔ کسی کی کوئی درخواست

نا منظور کرنی چاہتے تو حتی المقدور زبان سے نا منظوری کے الفاظ نہیں نکالتے تھے ۔ خاموش رہتے تھے یا اغماض برتتے تھے ۔ مزاج شناس اصحاب حضورؐ کے تیور سے سمجھ جاتے تھے ۔ چیخ چیخ کر بولتے ہوئے حضورؐ کو نہیں دیکھا گیا ۔

حضورؐ کے عادات و خصائل کے متعلق حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ہند بن ابی ہالہؓ کی روایتیں بھی ہیں ۔ حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ درگزر کرنا اور معاف فرما دینا حضورؐ کا شیوہ تھا ۔ حضورؐ نے کبھی کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا ۔ کبھی کسی خادم کو یا کسی جانور کو زد و کوب نہیں کیا ۔ حضور دوستوںؐ میں پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے ۔ باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے کہ وہ حافظوں میں محفوظ ہو جاتی تھیں ۔ گھر میں تشریف لاتے تو چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی ۔

حضرت علیؓ اپنے بچپن سے حضورؐ کی وفات تک حضورؐ کے ساتھ رہے ۔ حضرت عائشہؓ بیوی تھیں ۔ حضرت ہند بن ابی ہالہؓ بھی بالکل قریبی آدمی تھے ۔ حضورؐ کی گودیوں کے کھلائے ہوئے ، وہ کہتے ہیں ۔ حضورؐ انسان تو انسان کسی چیز کو بھی برا نہیں کہتے تھے ۔ مثلاً کھانا جیسا سامنے آ جاتا ناک بھوں چڑھائے بغیر نوش فرما لیتے ۔ ذاتی معاملات میں حضورؐ نے کبھی غصہ نہیں کیا ۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہار تشکر فرماتے تھے ۔ حضرت خدیجۃؓ الکبرٰی کا وہ فقرہ بھی یہاں دہرانے کے قابل ہے جو اس وقت فرمایا تھا جب حضرت جبریل علیہ السلام حضورؐ کو پہلی دفعہ دکھائی دیے اور حضورؐ گھبرائے ہوئے غار حرا سے جلدی جلدی گھر پہنچے ، حضورؐ نے کہا کہ خدیجہؓ ! مجھے اپنی جان کا خطرہ ہے تو حضرت خدیجہؓ نے جواب دیا : اللہ آپ کی حفاظت کرے گا ۔ آپ صلہٗ رحم کرتے ہیں ۔ غربا کو مدد دیتے ہیں مقروضوں کے قرض چکاتے ہیں ۔ مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں ۔

حضرت خدیجہؓ کی یہ رائے حضورؐ کے بارے میں نبوت سے قبل تھی ۔ پندرہ برس حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی قبل نبوت بیوی رہیں اور دس برس بعد نبوت ۔ نبوت کے بعد حضرت خدیجہؓ کی جو رائے ہوگی وہ اس سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے اللہ نے اپنا رسول مقرر کیا ہے ادھر حضرت خدیجہؓ نے کہا ۔ آپ سچے ہیں ۔ میں آپ پر ایمان لاتی ہوں اور پھر اسلام کی خاطر اپنے آپ کو امیر سے غریب بنا لیا ۔ حضورؐ کی کچھ ایسی ہی عادات و خصائل تھیں جنھوں نے حضرت خدیجہؓ پر حضورؐ کی حقانیت کا سکہ بٹھا رکھا تھا ۔

حضرت عائشہؓ نے ایک اور موقع پر فرمایا ۔ کَانَ خُلُقُهُ قُرْآنَ ۔ حضورؐ کے عادات و خصائل قرآن مجید کے مطابق تھے ۔ قرآن کہتا ہے لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفعَلُوْنَ ۔ جو کرتے نہیں وہ کہتے کیوں ہو ۔ حضورؐ جو کہتے تھے وہ کرتے تھے ۔ اللہ تعالیٰ کا بھی حضورؐ کی نسبت ارشاد ہے ۔

"اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْم ۔ اے محمدؐ ! تمھارا اخلاق بہت اعلیٰ ہے ۔"

اسلام متوازن دین ہے ۔ اسلام اعتدال سکھاتا ہے ۔ اسلام غلو پسند نہیں کرتا ۔ حضورؐ کا ہر عمل معتدل اور غلو سے پاک تھا ۔ حضورؐ قرآنی تعلیم کا نمونہ تھے ۔

حضورؐ جو عمل جس طرح اختیار کر لیتے تھے پھر اسے اسی طرح کیے جاتے تھے ۔ موسلا دھار بارش وہ اثر نہیں چھوڑتی جو مستقل تقاطر کا ہوتا ہے ۔ موسلا دھار بارش کا پانی بہ جاتا ہے اور مستقل تقاطر پتھر میں گڑھا ڈال دیتا ہے ۔ استقلال بڑی صفت ہے ۔ استقلال سے کام بوجھ نہیں رہتا ۔ طبیعت کا جزو بن جاتا ہے ۔ انسان پھر اس کے برعکس کام کر ہی نہیں سکتا ۔

حضورؐ دن رات نمازیں نہیں پڑھتے تھے - بارہ مہینے روزے نہیں رکھتے تھے لیکن جتنی عبادت کرتے تھے پابندی سے کرتے تھے - حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں - حضورؐ رات کے ایک حصے میں نفل پڑھنے کے عادی تھے - ان نفلوں کی مقررہ تعداد حضورؐ نے بیماری کی وجہ سے بھی کبھی ناغہ نہیں کی -

حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے دن کے تین حصے کر رکھے تھے - ایک حصہ خاص اللہ کے لیے تھا - ایک اللہ کے بندوں کے لیے اور ایک اپنی ذات کے لیے - بیماروں کی عیادت حضورؐ فرماتے تھے - دوسروں کو بھی تاکید کیا کرتے تھے کہ عیادت ضرور کرنی چاہیے - عیادت مسلمان کے لیے مثل فرض ہے -

حضورؐ بیمار کو دلاسا دیتے - اس کی صحت کی دعا کرتے - بیمار زبان سے مایوسی کا کلمہ نکالتا تو منغض ہو جاتے مایوسی اور بدفالی کی باتیں حضورؐ پسند نہیں فرماتے تھے - عیادت میں مسلم و غیر مسلم کی قید نہیں تھی - حضورؐ غیر مسلموں کی عیادت بھی کرنے جاتے تھے -

حضورؐ سلام میں سبقت کیا کرتے تھے - راستے میں خاموش چلتے تھے لیکن سلام کرتے جاتے تھے -

مصافحے کے واسطے دوسرے کے ہاتھ بڑھانے کا انتظار نہیں ہوتا تھا - خود ہاتھ بڑھا دیتے تھے اور پھر ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے جب تک دوسرا نہیں چھوڑتا تھا - ہاں یہ ہدایت تھی کہ جو صاحب حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوں وہ اندر آنے کی اجازت بعد میں مانگیں ، پہلے سلام علیکم کہیں - حضورؐ کسی کے ہاں جاتے تو وہاں حضورؐ اول سلام کرتے اور پھر پوچھتے کہ اندر آ سکتا ہوں - یونہی گھروں میں گھسے نہیں چلے جاتے تھے اور اوروں کو بھی بتاتے تھے کہ سلام کر کے اور اجازت لے کر دوسرے کے گھر میں

قدم رکھا کرو - اجازت مانگتے وقت اپنا نام بتایا کرو - صرف " میں ہوں " نہ کہا کرو -

تین دفعہ دستک دینے کے باوجود جواب نہ ملتا تو حضورؐ واپس لوٹ جاتے تھے - دستک نہیں دیے جاتے تھے -

حضورؐ ہر شخص کی بات کامل یکسوئی کے ساتھ سنتے تھے - بات کرنے والا بات کر چکتا اور منہ ہٹا لیتا تب حضورؐ بھی دوسری طرف متوجہ ہوتے تھے -

حضورؐ اپنے گھر میں بھی نمایاں ہو کر نہیں بیٹھتے تھے اور دوسروں کے ہاں بھی ممتاز جگہ بیٹھنا پسند نہیں فرماتے تھے -

سب مل کر کام کرتے تو حضورؐ ان کے ساتھ مساویانہ شریک رہتے تھے - یہ بھی حضورؐ کو نا پسند تھا کہ خود سوار ہوں اور ہمراہی پیدل چلیں -

غزوہ بدر میں سواریوں کی قلّت تھی - طے پایا کہ تین تین آدمی باری باری ایک اونٹ کی سواری لیں - حضورؐ نے اپنے ساتھ بھی دو آدمیوں کو شریک کیا - انھوں نے جب ان کی باری آئی تو اپنی باری چھوڑنی چاہی - حضورؐ نے فرمایا تم مجھ سے زیادہ پیادہ پا نہیں چل سکتے اور ثواب کا بھی میں تم سے کم حاجت مند نہیں ہوں - اللہ کو وہ بندہ برا لگتا ہے جو ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے -

حضورؐ اپنے کاموں کا اجر اللہ سے لینا چاہتے تھے - بندوں سے لینا نہیں چاہتے تھے -

ایک دفعہ حضورؐ کے وضو کا پانی چند اصحاب نے زمین پر نہیں گرنے دیا - اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور منہ پر مل لیا - حضورؐ نے پوچھا یہ کیا کر رہے ہو - انھوں نے کہا اللہ اور اللہ کے

رسولؐ کی محبت حاصل کرنے کے لیے ہم یہ کر رہے ہیں - حضورؐ نے فرمایا اللہ اور اللہ کے رسولؐ کی محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے - سچ بولا کرو - امین بنو اور پڑوسیوں سے اچھا سلوک کرو - اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کا یہ طریقہ ہے -

حضورؐ ہر کام سے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھتے تھے- ہر کام دائیں ہاتھ ، دائیں پاؤں اور دائیں رخ سے شروع فرماتے تھے - مثلاً کچھ تقسیم کرنا ہوتا تو دائیں ہاتھ اور دائیں رخ سے تقسیم کرتے تھے بلا لحاظ شخصیت- مسجد میں جاتے تو پہلے دایاں پاؤں اندر رکھتے-

کوئی مسلمانوں پر احسان کرتا اور وہ مدینے میں مہمان بن کر آتا تو اس کی مہانداری کے کام حضورؐ خود انجام دیتے تھے اوروں سے اس کی خدمت نہیں کراتے تھے -

بروں کو برا کہنے حتٰی کہ منافقوں کو منافق کہنے میں حضورؐ کو تأمّل ہوتا تھا - برا کہ دینے کی بے دھڑک جرأت حضورؐ کے نزدیک مستحسن نہیں تھی -کسی کی کوئی بات نا پسند ہوتی تھی تو اسے اول تو حضورؐ برداشت کر لیتے تھے یا چہرے پر اثر دیکھ کر نا پسندیدہ حرکت کرنے والا سمجھ جاتا تھا - یا دوسرے اس کو سمجھا دیتے تھے - یا بعض اوقات حضورؐ دوسروں سے کہ دیا کرتے تھے کہ فلاں شخص کو سمجھا دو کہ ایسی حرکت نہ کیا کرے - بعض اوقات خود بھی سمجھایا ہے مگر اس طرح کہ غلط کار کی ذلت نہیں ہوئی - وقت ٹال کر عام خطاب کر دیا کہ فلاں حرکت نا مناسب و ناشائستہ ہے -

حضورؐ نے مدت‌العمر کسی سے بدزبانی نہیں کی - مدت‌العمر کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیا -

حضورؐ کسی سے کوئی چیز لیتے تھے تو اس سے بہتر اسے واپس

کرتے تھے - فیاض طبعی کے سبب اکثر قرض لینا پڑتا تھا - حتیٰ کہ وفات کے وقت بھی حضور ؐ کی زرہ رہن تھی - لیکن قرض کی ادائیگی کا اتنا خیال تھا کہ مقروض کے جنازے کی نماز جب پڑھاتے تھے جب اس کا قرض ادا کر دیتے تھے - قرض دینے والا عموماً یہودی ہوتا تھا - یہودی قرض کے تقاضے کرتا اور مزاج دکھاتا تو فرماتے قرض خواہ کو ان باتوں کا حق ہے -

ایک دفعہ کہا - میں تین دن سے زیادہ روپیہ اپنے پاس نہیں روکتا - لیکن اگر میرے ذمے قرض ہوتا ہے تو اس کی ادائیگی کے انتظار میں روپیہ تین دن سے زیادہ رکھے رہتا ہوں -

ایک دفعہ فرمایا - وہ بہترین انسان ہے جو خندہ پیشانی اور خوش معاملگی سے قرض ادا کر دیتا ہے -

فیاض طبعی کا یہ حال تھا کہ نہیں کرنا جانتے ہی نہ تھے - مدد مانگنے والا خالی نہیں جاتا تھا - کچھ موجود نہ ہوتا اور قرض بھی نہ مل سکتا تو فرماتے کہ دوں گا ضرور ، پھر آنا - انکار نہیں کرتے تھے - حضور ؐ کا قول تھا - میں تو بانٹنے والا اور خزانچی ہوں - دینے والا اللہ ہے -

جن کے ہدیے اور تحفے حضور ؐ قبول فرماتے تھے ان کا بدلہ ضرور کرتے تھے - ایک دفعہ قیصر روم نے حضور ؐ کی خدمت میں ایک پوستین بھیجی حضور ؐ نے اسے پہن کر دیکھا اور پھر حضرت جعفر طیار ؓ کو دے دی اور کہا نجاشی (شاہ حبش) کو بھیج دو -

حضرت ابو ایوب انصاری ؓ جن کے ہاں مدینے پہنچ کر حضورؐ نے چھے مہینے قیام فرمایا تھا - انہیں حضور ؐ بہت تحفے بھیجا کرتے تھے - تحفے کا مطلب پوستین جیسی چیزیں ہی نہیں ہیں - جو بھی بھیجا جا سکتا تھا بھیج دیا جاتا تھا - حضور ؐ اپنے اوپر کسی کا بوجھ نہیں رکھتے تھے -

حضورؐ لوگوں کو اپنے سے آچٹانے والے انسان نہیں تھے اور اشاعت اسلام کی خاطر تو تالیف قلوب کا بہت خیال رکھتے تھے لیکن تالیف قلوب اپنی جگہ تھی اور عدل و انصاف اپنی جگہ ۔ حضورؐ کی امانت داری اور حضورؐ کا انصاف دو وصف ایسے ہیں جن پر غیر مسلموں نے بھی انگلی نہیں اٹھائی ۔ مکےؓ کے غیر مسلم شاید مخالفت کے زمانے میں بھی امانتیں حضورؐ ہی کے پاس رکھواتے تھے اور مدینے میں یہودی اپنے مقدمے حضورؐ کے پاس لاتے تھے ۔

نرمی اور مہربانی اسی وقت تک کی جاتی جب تک جرم ضابطے میں نہیں آجاتا تھا ۔ ضابطے میں آجانے کے بعد اللہ کے حکم کی تعمیل قطعی ہوتی تھی ۔

ایک دفعہ ایک بڑی خاندانی عورت پر چوری کا جرم ثابت ہوگیا ۔ حضورؐ نے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا ۔ لوگ چاہتے تھے کہ حضورؐ سزا میں تخفیف کریں اور سفارشیں لاتے تھے مگر حضورؐ نے فرمایا کہ حدود اللہ کی زد میں تو میری بیٹی بھی آجاتی تو اسے بھی معاف نہ کرتا ۔ قانون محض غربا کے لیے نہیں ۔ امرا کے لیے بھی ہے ۔ پچھلی امتیں تباہ اسی وجہ سے ہوگئیں کہ غریبوں کو سزائیں دیتی تھیں اور امیروں سے در گزر کرتی تھیں ۔ بحیثیت نبی اور مامور سزا دینا حضورؐ کا فرض تھا مگر حضورؐ کی طبیعت کا یہ حال تھا کہ سزا دینے کے بعد روتے تھے ۔

ایک دفعہ ایک شخص کو قتل کیا گیا ۔ اس کی بیٹی نوحہ کرتی حضورؐ کی خدمت میں پہنچ گئی ۔ حضورؐ بھی رونے لگے اور اپنے رونے کی نسبت فرمایا ۔ یہ محمدؐ ابن عبداللہ کا فعل ہے اور وہ فعل (یعنی مجرم کو قتل کرانا) محمدؐ رسول اللہ کا فعل تھا ۔

حضورؐ جرموں اور عیبوں کی ٹوہ لگانے یا جُرموں اور عیبوں کے اچھالنے کو قطعی پسند نہیں فرماتے تھے اور کوئی کسی کی زیادہ

مدح کرتا تو اسے بھی ٹوک دیتے تھے کہ ممدوح سن لے گا تو اس کا نفس موٹا ہو جائے گا ۔ حضور ؐ کی ہدایت تھی کہ مدح ہی کرنی ہو تو کہو میرا ایسا خیال ہے ۔

اپنی بابت بھی کہتے رہتے تھے کہ مجھے میرے درجے سے مت بڑھاؤ میں بس اللہ کا بندہ اور اللہ کا فرستادہ ہوں ۔ مجھے دوسرے انبیاء پر فضیلت نہ دو ۔ میرے لیے وہ الفاظ استعمال کرو جو اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء کے لیے استعمال کیے ہیں ۔ مثلاً ایک دفعہ کسی نے یا خیرالبریہ کہہ کر حضور ؐ سے گفتگو شروع کی ۔ حضور ؐ نے فرمایا ۔ خیرالبریہ تو ابراہیم علیہ السلام تھے ۔

ایک دفعہ ایک صاحب کی زبان سے نکل گیا " جو اللہ چاہے اور جو اللہ کا رسول چاہے حضُور ؐ نے کہا ۔ تم نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا ۔ صرف اللہ کا نام لو ۔ کہو جو اللہ چاہے ۔

حضور ؐ ایک دفعہ کسی شادی کے گھر میں پہنچے تو وہاں لڑکیاں گیت گا رہی تھیں ۔ حضور ؐ کو دیکھ کر انھوں نے گانا شروع کیا ۔ فِینَا رَسُوْلٌ یَعْلَمُ مَا فِیْ غَدٍ (ہم میں وہ رسول تشریف فرما ہیں جو مستقبل کا حال جانتے ہیں) حضُور ؐ نے فرمایا ۔ یہ کیا گانے لگیں ۔ وہی گائے جاؤ جو گا رہی تھیں ۔

اللہ تعالیٰ نے حضور ؐ کو عزم و استقلال کا پیکر بنایا تھا ۔ قرآن مجید میں تمام انبیاء کے لیے اولوالعزم من الرسل کہا گیا ہے ۔ حضُور ؐ اس وصف کے کامل مظہر تھے ۔

مکے کا یاس انگیز دور تھا ۔ متواتر ناکامیوں سے متأثر ہو کر صحابہؓ کی زبان پر کچھ مایوسانہ الفاظ آ گئے ۔ حضُور ؐ کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہوگیا ۔ فرمایا " کیا کہتے ہو ۔ تم سے قبل مسلمان آروں سے چیرے جا چکے ہیں ۔ ان کی کھالیں نوچی جاتی تھیں ۔ واللہ اسلام ایک دن کامیاب ہو گا ۔ صنعا اور حضر موت کے درمیان

کا سا خطرناک راستہ اکیلا انسان طے کرے گا اور اسے اللہ کے سوا کسی نوع کا کھٹکا نہیں رہے گا۔"

حضورؐ کا قول تھا کہ میں رحمت بن کر آیا ہوں۔ بد دعا دینے نہیں آیا ہوں۔ کفار سے بد تر منافقین تھے۔ حضورؐ ان تک سے اخلاق برتتے تھے۔ ان کی غلطیاں نظر انداز کر دیتے تھے۔ عبداللہ بن ابی جیسے منافق کی بابت ایک دفعہ فرمایا کہ یہ بہرحال کہلاتا تو مسلمان ہے اسے گزند پہنچاؤں گا تو ناواقف لوگ سمجھیں گے کہ اپنوں کے ساتھ محمدؐ کا برا سلوک ہے۔ عبداللہ بن اُبی نے حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ کو اس وقت جب کہ حضرت عباسؓ مسلمان نہیں تھے ایک کرتہ دیا تھا۔ عبداللہ بن اُبیؔ مرا تو حضورؐ نے مسلمانوں کے روکنے کے باوجود اسے اپنا کرتہ پہنوا کر دفن کرایا۔

حضورؐ کی مجلس سراپا سنجیدگی اور متانت ہوتی تھی۔ حضورؐ بولتے تھے تو حاضرین اتنی توجہ سے سنتے تھے کہ ہلتے جلتے نہیں تھے لیکن سنجیدگی اور متانت سے مراد خشکی وافسردگی نہ لیجیے گا۔

ایک دفعہ حضورؐ صحابہؓ کے ساتھ بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے۔ حضرت علیؑ برابر تشریف فرما تھے۔ حضرت علیؑ کھجوریں کھاتے جاتے تھے اور گٹھلیاں حضورؐ کی گٹھلیوں میں ملاتے جاتے تھے۔ جب کھجوریں کھائی جا چکیں تو حضرت علیؑ نے کہا بتاؤ کھجوریں کس نے زیادہ کھائی ہیں؟ حضورؐ نے فرمایا۔ ذرا یہ بھی دیکھنا کہ گٹھلیوں سمیت کھجوریں کون کھا گیا؟

ایک دفعہ ایک ضعیف العمر صحابیہؓ حاضر خدمت ہوئیں اور کہنے لگیں۔ میرے لیے دعائے مغفرت کیجیے۔ حضورؐ نے فرمایا۔ بڑھیا کوئی جنت میں نہیں جا سکتی۔ وہ گھبرائیں۔ حضورؐ نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ بڑھیائیں بھی جوان ہو کر جنت میں جائیں

گی - ان کا شباب عود کر آئے گا -

ایک دفعہ ایک بہت غریب صحابی مسجد میں جھاڑو دینے پر متعین تھے - ان کا انتقال ہوگیا - لوگوں نے حضورؐ کو اطلاع نہیں دی - عرصے کے بعد حضورؐ نے خود پوچھا وہ صاحب کہاں ہیں - دکھائی نہیں دیتے - عرض کیا گیا کہ وفات پا گئے - کہا مجھے کیوں اطلاع نہیں کی - لوگوں نے اس طرح جواب دیا جیسے کہتے ہیں کہ معمولی آدمی تھے - کیا اطلاع کرتے - حضورؐ نے ان کی قبر کا پتا دریافت فرمایا اور قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی -

بچوں پر حضورؐ خاص طور پر شفقت فرماتے تھے - حضورؐ کہیں باہر سے تشریف لاتے اور سواری پر سوار ہوتے تو راستے میں جو بچے مل جاتے انہیں اپنے ساتھ آگے پیچھے بٹھا لیتے تھے - راستہ چلتے بچوں کو خود سلام کرتے تھے -

ایک غزوے میں چند بچے جھپیٹ میں آ کر مر گئے- حضورؐ نے ان کا بڑا غم کیا - کسی صحابی نے کہا - وہ مشرکوں کے بچے تھے - حضورؐ نے فرمایا بچے مشرکوں کے بھی تم سے بہتر ہیں-خبردار بچوں کو قتل مت کرنا - خبردار بچوں کو قتل مت کرنا - دو دفعہ فرمایا - پھر کہا ہر بچہ اللہ کی فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے -

حضورؐ کسی ماں کو دیکھتے کہ اپنے بچے سے محبت کر رہی ہے تو بہت متأثر ہوتے - ماؤں اور بچوں کی محبت کے قصے سنتے تو فرماتے - جسے اللہ اولاد کی محبت دے اور وہ اولاد کا حق بجا لائے وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ رہے گا -

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ حضورؐ نے ایک دفعہ فرمایا - نماز کے وقت مقتدی عورتوں میں سے کسی کا بچہ روتا ہے تو میں نماز مختصر کر دیتا ہوں تا کہ بچے کی ماں بے چین نہ ہو -

بچوں سے چھل کی باتیں کرتے تھے - ام خالد چھوٹی سی

تھیں - ایک دفعہ وہ سرخ رنگ کا کرتہ پہنے نظر آئیں - ان سے فرمایا - سنہہ سنہہ - حبشی زبان میں سنہہ کے معنی ہیں خوشنما - حضرت ام خالد کی پیدائش اتفاق سے حبش کی تھی اور ان کا کچھ وقت وہاں گزرا تھا - اس مناسبت سے حضور نے حبشی زبان کا لفظ استعمال کیا -

کوئی شخص فصل کا میوہ نذر کرتا تو حضورؐ حاضرین میں سے سب سے پہلے بچوں کو بانٹتے تھے -

ایک دفعہ حضور بچوں سے پیار محبت کا اظہار کر رہے تھے - کسی کی زبان سے نکلا میرے دس بچے ہیں - میں تو اپنے بچوں کو بھی نہیں چومتا چاٹتا - حضور نے فرمایا - تمہارے دل سے اللہ محبت سلب کر لے تو میں کیا کر سکتا ہوں -

عورتوں کو تو حضورؐ نے انسانیت کا مرتبہ عطا فرمایا ہے اور مردوں کے برابر لا بٹھایا ہے اسلام سے پہلے خیال تھا کہ عورتیں بے روح ہوتی ہیں - انھیں مویشیوں سے بد تر حالت میں رکھا جاتا تھا - وہ بچپن میں باپ دادا کی کنیز بنتی تھیں - جوانی میں شوہر کی اور بڑھاپے میں بیٹوں کی - بیٹیوں کی پیدائش ناگوار گذرا کرتی تھی - انھیں زندہ دفن کر دیا جاتا تھا - زندہ رہتی تھیں تو جائیداد کی طرح ورثے میں تقسیم کی جاتی تھیں -

حضورؐ نے جس طرح ارشاد و احکام سے عورتوں کے حقوق قائم کیے اور عورتوں کی منزلت بڑھائی اسی طرح عملی برتاؤ بھی حضورؐ کا عورتوں کے ساتھ ایسا تھا کہ لوگ اسے دیکھ کر اپنا پچھلا طریقہ عورتوں کے معاملے میں دوبارہ اختیار نہیں کر سکتے تھے -

حضورؐ نے مویشیوں تک کو بہت سی مصیبتوں سے چھڑا دیا - عرب اونٹ کے گلے میں قلّادہ لٹکایا کرتے تھے - حضورؐ نے منع کیا کہ خواہ مخواہ ایک جاندار کو تکلیف میں ڈالتے ہو - زندہ دنبے کی

چکی کاٹ لیتے تھے - اس سے روکا - دُم اور ایال کاٹنے کی بھی ممانعت فرمائی - کہا ، دم جانور کا مورچھل ہے اور ایال لحاف - جانوروں کو ساز پہنائے رکھنے کی ممانعت کی - نیز فرمایا جانوروں کو اپنی کرسی اور نشست گاہ نہ بناؤ - یعنی ان پر ہر وقت چڑھے نہ بیٹھے رہا کرو - عرب جانوروں کو باندھ کر ان پر نشانہ بازی کیا کرتے تھے - آپ نے اسے ناجائز قرار دیا - جانوروں کو لڑوانا بھی ناجائز بتایا -

ایک دفعہ کسی نے چڑیا کا انڈا اٹھا لیا - چڑیا بے قرار ہوگئی - حضورؐ نے حکم دیا کہ انڈا چڑیا کو واپس پہنچاؤ -

ایک صحابی جنگل میں سے کچھ پرند پکڑ لائے اور بیان کیا کہ میں نے انھیں پکڑا تو ان کی ماں دیر تک میرے سر پر منڈلاتی رہی - حضورؐ نے فرمایا واپس جاؤ اور پرندوں کو ان کی جگہ چھوڑ آؤ -

حضورؐ لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ جانوروں کے معاملے میں بھی اللہ سے ڈرنا چاہیے - اللہ کا ارشاد ہے - **وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ** - اے محمدؐ! ہم نے تمھیں سارے عالموں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے - لہٰذا اس خزانۂ رحمت سے انسان ، حیوان ، دوست ، دشمن ، مسلم ، غیر مسلم ، عورت ، مرد ، بوڑھے ، بچے سب کو حصہ ملتا تھا -

ایک حدیث ہے - کوئی اس وقت تک کامل مسلمان ہی نہیں ہوتا جب تک وہ دوسروں کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے -

ایک دفعہ کسی نے دعا مانگی کہ الٰہی ! مجھ کو اور محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کو بخش دے - حضورؐ نے فرمایا - اللہ کی رحمت کو تم نے اپنے لیے اور میرے لیے محدود کر لیا -

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ پر چڑھنے لگا تو اس کی زبان سے نکلا :

یا اللہ ! مجھ پر اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر رحمت بلا شرکت غیرے نازل کر۔ حضُور نے صحابہ سے کہا کہ بتاؤ راہ یہ زیادہ بھولا ہوا ہے یا اس کا اونٹ۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں حضُور صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم۔ " انسان کامل " گزرے ہیں اور حضُور ہی کا اُسوۂ حسنہ انسانیت کے لیے آخری معیار ہے۔ آپ پر درُود و سلام ہوں۔

میاں بشیر احمد

(۱۸۹۳ تا ۱۹۷۱)

تشکیل پاکستان

ہندوستان میں اسلامی حکومت اگرچہ کہنے کو اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے ڈیڑھ سو سال بعد تک قائم رہی لیکن دراصل حکومت اور امراء دونوں کی طاقت اور سطوت اٹھارویں صدی کے وسط تک ختم ہو چکی تھی - انیسویں صدی کے شروع میں مسلمانوں کے سیاسی تنزل کی تکمیل ہوئی چنانچہ ۱۸۰۳ء میں انگریز دہلی میں داخل ہوئے - لیکن اسی زمانے میں بعض افراد کے دل میں مذہبی احیاء اور معاشری اصلاح کا خیال پیدا ہوا - شاہ ولی اللہؒ شاہ عبدالعزیز وغیرہ کی کوششوں سے علم دوست لوگوں میں مذہب کی صحیح واقفیت بڑھتی گئی لیکن عوام کی مذہبی حالت بہت گری ہوئی تھی اور مذموم معاشری رسموں میں مسلمانوں اور ہندوؤں میں زیادہ فرق نہ تھا -

سیاسی تنزل اور معاشری تخریب کے اس نازک وقت میں ایک پُرخلوص مصلح سید احمد بریلوی پیدا ہوئے جنھوں نے ۱۸۱۶ء سے ۱۸۳۱ء تک پندرہ سال مسلمانوں کی مذہبی و معاشری خرابیوں کو دور کرنے کی پوری کوشش کی - اسی سلسلے میں مذہبی آزادی کے

حصول کے لیے انھوں نے ۱۸۲۶ء میں سکھوں کے خلاف مذہبی جہاد کی مہم بھی شروع کی جس کے آخر میں سات ہزار مجاہدین نے پشاور کے قریب میدان جنگ میں نمایاں کامیابی حاصل کی اور سید احمد نے ایک نظام حکومت قائم کر کے قبائل کی معاشری اصلاح کے احکام نافذ کیے - لیکن بعض سرداروں کی غداری سے جو سکھوں کے ساتھ شریک ہو گئے آخر کار مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ان کا رہنما ٦ مئی ۱۸۳۱ء کو بالا کوٹ میں شہید ہوا یعنی مسلمانوں کی مساعی خود مسلمانوں ہی کے ہاتھوں برباد ہو گئیں - یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سید احمد بریلوی نے بار بار ہندوستان کے مسلمانوں کو دوسری قوموں کے مقابلے میں جمع کیا اور ان کے اصلاحی کام کو اُن کے بعض مذہبی جانشینوں نے جاری رکھا - سرسید بعض باتوں میں اپنے ہم نام کے ہم خیال تھے اور اُن کے عقیدت مند تھے - اس زمانے میں بہار میں مسلمانوں میں فرائضی تحریک اٹھی جس کا مقصد غریب مسلمانوں ، خصوصاً مؤمنوں کی نا گفتہ بہ حالت کی اصلاح اور اُن کی امداد تھا -

۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی رہی سہی عزت بھی خاک میں مل گئی - انگریزی حکومت سو سال سے اُن کی ذلت کے درپے تھی - بتدریج مسلمانوں کی زمینیں اور عہدے چھین لیے گئے ، اسلامی تعلیم کے ذرائع ختم کر دیے گئے ، ۱۸۳۷ء میں فارسی زبان عدالتوں سے خارج کر دی گئی - ۱۸۵۷ء کے بعد اُن پر عتاب اور دباؤ بڑھتا گیا اس طرح مسلمان پسپا بھی ہوے اور ان مظالم سے متأثر ہو کر نئی حکومت اور اس کے اداروں سے بیزار بھی ہوتے گئے - اُدھر ہندوؤں کی بے رخی نے اُن کے زخموں پر اور بھی نمک چھڑکا - اس نا گفتہ بہ حالت میں ایک دور اندیش ہمدرد ملت اُٹھا جس نے اپنی مایوس، پسماندہ قوم کو اُمید ، محنت اور ترقی کا زندگی بخش پیغام دیا - یہ مرد خدا سرسید احمد خان تھے - یہ انھیں کی جدوجہد کا نتیجہ تھا کہ گو

"ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں ۔"

سرسید نے قدامت پسند مسلمانوں کو نئے زمانے کی ضروریات سے آگاہ کیا اور ہزار دقتوں سے اُن کو نئے علوم کے حصول اور نئی حکومت سے تعاون پر آمادہ کیا ۔ اپنی مذہبی تصانیف اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے اجراء سے انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ اسلام عقل کے اصولوں پر مبنی ہے ۔ اُن کی تعلیمی مساعی ۱۸۷۷ء میں تکمیل کو پہنچیں جب علی گڑھ کالج کا افتتاح ہوا جو کم از کم تیس برس تک مسلمانان ہند کا واحد قومی مرکز بنا رہا ۔ ۱۸۸۴ء میں سرسید نے پنجاب کا دورہ کیا جہاں "زندہ دلان پنجاب" کی قدردانی سے اُن کو بڑی تقویت پہنچی ۔ پنجاب کے مسلمان "سرسید کی منادی پر اس طرح دوڑے جس طرح پیاسا پانی پر دوڑتا ہے ۔" ایک طرف وہ علی گڑھ سے وابستہ ہوئے دوسری طرف انھوں نے لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا ادارہ قائم کیا ۔ ۱۸۸۶ء میں سرسید نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس کے اجلاس ہر سال مختلف مقامات پر منعقد ہو کر مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پھونکنے کا باعث ہوئے ۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اُردو کو موقوف کر کے ملک میں بھاشا زبان جاری کی جائے ۔ سرسید کہتے تھے کہ "یہ پہلا موقعہ تھا جب مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا محال ہے اور دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ۔" ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگرس کی بنا پڑی ۔ سرسید نے مسلمانوں کو اس میں شرکت کرنے سے روکا کیونکہ اُن کی دور اندیشی نے دیکھ لیا کہ اس سے مسلمانوں کو بحیثیت قوم کے نقصان پہنچے گا ۔ اپنے ایک اہم بیان میں انھوں نے کہا کہ جمہوری طریقہ ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ۔ یہ امر قابل غور ہے کہ سرسید کے پیش نظر انگریزوں کی خوشنودی نہ تھی بلکہ اپنی قوم کی ترقی ۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے

ہندوستانی تھے جنھوں نے اپنی مشہور تصنیف "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر حکومت کو توجہ دلائی کہ غدر کا سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستانیوں کو ملک کی سیاسی کونسلوں میں شامل نہ کیا گیا۔ پھر ۱۸۷۸ء میں جب وہ کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تو انھوں نے ملکی اور قومی مفاد پر پے در پے تقریریں کیں۔ ۱۸۹۸ء میں جب سرسید نے انتقال کیا تو اُن کی قوم اپنے خواب گراں سے جاگ چکی تھی۔

سرسید کے بعد ان کے رفقاء نے اُن کا شان دار کام جاری رکھا۔ محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ، شبلی وغیرہ نے تعلیمی، سیاسی اور ادبی خدمات سرانجام دیں۔ محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو ترقی دی۔ وقار الملک ایک سیاسی جماعت کی تشکیل میں معاون ہوئے۔ حالی کی مسدّس نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں انقلاب کی لہر دوڑا دی، شبلی نے اسلامی تاریخ کے آئینے میں انھیں اپنی گذشتہ عظمت دکھا کر اُن کے دلوں کو گرما دیا۔ امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف سے مغربی حلقوں میں اسلام کی وقعت پیدا کی۔

علی گڑھ تحریک کی وجہ سے قوم میں کئی اور تحریکات شروع ہو گئیں۔ اختلافات ضرور رونما ہوئے لیکن ایک حد تک یہ نئی زندگی کا نشان تھے۔ سرسید، امیر علی اور دیگر بزرگوں نے اسلام کو مغربی علوم سے اس طرح جا ملایا تھا کہ اسے ایک ترقی یافتہ مذہب ثابت کیا۔ لیکن اس جدید علم الکلام کے رد عمل کے طور پر بعض اور مذہبی مساعی بر روئے کار آئیں۔

شبلی نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم کیا۔ دیو بند میں علماء نے قدیم طرز کی درسگاہ بنا کر ملک میں قدیم اسلامی علوم کے چراغ روشن کیے۔

ان مساعی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہب سے بیگانگی بہت حد تک کم ہو گئی اور مغرب کی ذہنی غلامی سے نجات ملی لیکن ساتھ ہی ایک ایسی فضا بھی پیدا ہو گئی جس میں اپنی ہر چیز اچھی اور دوسروں کی ہر چیز بری نظر آنے لگی - اس کی اصلاح ضروری ہو گئی -

اقبال نے آ کر اسلامی و مغربی علوم کے غائر مطالعے کے بعد اپنا خاص اسلامی فلسفہ قوم کے سامنے پیش کیا جس کا مقصد کامل ترین انسان کی انفرادی و اجتماعی نشوونما ہے - اقبال کا خیال ہے کہ انسان اطاعت ، ضبط نفس اور نیابت الٰہی کی تین منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی بلندی پر پہنچ سکتا ہے - اس ارتقا میں اسے مذہب کی رہنمائی درکار ہے - اقبال نے چار چیزوں پر زور دیا - اول توحید جس پر پورا ایمان عملاً انسان کو خوف و مایوسی سے آزاد کر دیتا ہے نیز توحید الٰہی ، توحید انسانی میں پرتو افگن ہوتی ہے - دوم رسول اکرمؐ سے محبت اور ان کی مکمل تقلید - سوم ، قرآن کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کی پیروی - چہارم ، رجائیت یعنی مایوسی اور غم پسندی کو ترک کرکے امید ، ہمت اور جرأت کی راہ اختیار کرنا - اقبال نے سچے مومن کی یوں تعریف کی ہے -

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں ، کردار میں اللہ کی برہان

قہّاری و غفّاری و قدّوسی و جبَروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال نے اپنی قوم کو یہ کہہ کر جگایا اور اکسایا کہ :

چلنے والے نکل گئے ہیں جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اپنے رہنماؤں کی پکار سن کر مسلمان قوم ترقی کی راہ پر کچھ چلنے تو لگی لیکن جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہوئے ، معاشی حیثیت سے وہ اپنے ہمسایوں سے کہیں پیچھے رہی ۔ تعلیمی حیثیت سے وہ ضرور کچھ بڑھی لیکن پھر بھی پسماندہ رہی البتہ اپنے قومی زبان و ادب کو اس نے باوجود اپنے انحطاط کے خوب چمکایا ۔ اُردو علم و ادب اور صحافت کو ترقی ہوئی اور ملک میں جابجا اُردو کی علمی و ادبی انجمنیں پھیل گئیں ۔ علی گڑھ کالج ۱۹۲۱ء میں یونیورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا اور منجملہ حیدر آباد (دکن) کی دوسری ترقیات کے وہاں جامعۂ عثمانیہ کا شاندار ادارہ قائم ہوا ۔ متمدن زندگی کے اکثر شعبوں میں مسلمان دوسروں سے پیچھے ضرور تھے لیکن یہ بات اب ان پر اور دوسروں پر ظاہر ہوگئی کہ جب بھی اور جہاں بھی وہ بڑھنے کی کوشش کریں وہ دوسروں سے ہیٹے نہیں رہتے ۔ البتہ باوجود ان سب ترقیوں کے یہ امر اظہر من الشمس تھا کہ جب تک قوم سیاسی حیثیت سے مضبوط و متحد نہ ہوگی اس کی ساری روایات اکارت جائیں گی اور اس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے ۔

مسلمانان ہند کی جدید سیاسی زندگی کی داستان یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس کے قیام کے بعد گو سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لیے قدم اٹھایا لیکن بالعموم ان کی قومی سیاست یہی تھی کہ مسلمان ملکی سیاست سے الگ تھلگ رہیں اور پہلے مغربی علوم کے حصول سے اپنی قوم کی حالت کو درست اور مضبوط کر لیں ۔ مگر بیسویں صدی کے شروع سے ایشیا اور اس کے ساتھ ہندوستان میں صورت حال دگرگوں ہونے لگی ، جاپان کی فتح سے ہندوؤں میں جذبۂ قومیت اور ابھرا اور انھوں نے تقسیم بنگال کے خلاف ۱۹۰۵ء میں ایک زبردست تحریک شروع کی ۔ علاوہ بریں اردو ہندی جھگڑے کے سلسلے میں یو ۔ پی کی حکومت نے علی گڑھ کے تعلیمی ادارے کو اس نیم سیاسی مسئلے میں دخل دینے سے حکماً

روک دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اور بھی ضروری ہو گیا کہ وہ اپنے تمدنی و سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد رکھیں۔ یوں (دسمبر ۱۹۰۶ء میں) مسلم لیگ قائم ہوئی اور ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات کا اہم حق حاصل کیا۔ پھر تقسیم بنگال کی تنسیخ (۱۹۱۱ء) اور جنگ بلقان و طرابلس (۱۹۱۲ء) سے جب مسلمانوں کو یقین ہو گیا کہ ان کے قومی اور بین الاقوامی حقوق حکومت برطانیہ کے ہاتھ میں محفوظ نہیں رہ سکتے تو انھوں نے ہندوستان کے لیے "سیلف گورنمنٹ" کا مطالبہ کیا (۱۹۱۳ء) اور کانگرس کی طرف تعاون کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ عظیم نے ہندوستانیوں کے دل میں حرکت پیدا کی کانگرس اور لیگ میں میثاق لکھنؤ کا مشہور معاہدہ ہوا جس کی وجہ سے برطانیہ ۲۰ اگست ۱۹۱۷ء کو یہ اعلان کرنے پر مجبور ہو گیا کہ ہندوستان کو بتدریج خود اختیاری حکومت دی جائے گی۔ لیکن جنگ کا ختم ہونا تھا کہ برطانوی حکومت نے ہندوستان سے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور ظالمانہ قوانین نافذ کرنے کی ٹھان لی (۱۹۱۹ء) اور ادھر یورپ میں ترکی کے حصے بخرے کرنے کی سازش کی۔ اس پر گاندھی نے علی برادران کی مدد سے عدم تعاون کی زبردست تحریک شروع کی (۱۹۲۰ء) لیکن اس تحریک کا ختم ہونا تھا کہ دوسرے ہندو لیڈروں نے شدھی اور سنگھٹن کی اشتعال انگیز کارروائیوں سے ہندو مسلم تعلقات کو قطعاً خراب کر دیا اس زمانے میں مسلمان لیڈر غفلت کی نیند سوئے رہے لیکن سائمن کمیشن کی آمد اور نہرو رپورٹ کی مسلم کش تجاویز پر وہ اپنے خواب سے چونکے (۱۹۲۸ء) اور آل انڈیا مسلم کانفرنس میں جمع ہو کر انھوں نے ایک متحدہ سیاسی مطالبہ جو مسٹر جناح کے چودہ نکات سے مطابقت رکھتا تھا دنیا کے سامنے پیش کیا (۱۹۲۹ء) ادھر کانگرس نے گاندھی کی قیادت میں مکمل آزادی کا اعلان کرکے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی (۱۹۳۰ء) اس

دوران میں لندن میں گول میز کانفرنس کا انعقاد ہوا - (۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۲ء) اور برطانوی حکومت نے اپنا فرقہ وارانہ فیصلہ سنایا لیکن ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی کے باعث ہندو مسلمانوں میں کوئی سمجھوتا نہ ہوسکا - ۱۹۳۵ء میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے مرکز میں فیڈریشن اور صوبوں میں خود اختیاری حکومت کا نفاذ طے پایا - ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد کانگرس پہلے چھے اور پھر دو اور صوبوں میں حکومت کرنے لگی جس سے اس کا سر پھر گیا اور اس نے مسلم لیگ سے منہ پھیر کر مسلمانوں کو بحیثیت قوم کے ملیامیٹ کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا - چنانچہ کانگرسی حکومتوں نے اردو کو مٹایا ، ہندی کو ابھارا اور ہندوانہ تمدن کے دیگر اداروں اور نشانات کو فروغ دے کر ہندوستانی مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو ہندوؤں میں مدغم کرنے میں بیسیوں علانیہ و خفیہ مساعی کیں -

یہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک بے حد نازک وقت تھا - مسلمانوں میں کہنے کو کئی سیاسی جماعتیں تھیں - مسلم لیگ جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی ، کبھی جاگتی کبھی سوتی رہی - اس کے بعد ۱۹۱۹ء کے ہنگامہ خیز سال میں جمعیۃ العلماء بنی - ۱۹۲۹ء میں خدائی خدمتگار اور مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا اور اسی سال میں نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی اپنی ایک کانفرنس منعقد کی - ۱۹۳۷ء میں جب کانگرس برسر اقتدار آئی اور اس نے مسلمانوں کی قومی ہستی کو ختم کرنا چاہا تو سوال پیدا ہوا کہ مسلمان اس کا کیا جواب دیتے ہیں - اس خطرناک وقت میں مسلم لیگ کی قیادت جس زبردست شخصیت کے ہاتھ میں تھی اس نے کانگرس کے چیلنج کو دلیری سے قبول کیا - یہ قائد اعظم محمد علی جناح‌رح تھے جو ایک طرف سیاسی بات چیت میں انگریزی حکومت اور کانگرسی لیڈروں کے ساتھ پورے اترے اور دوسری طرف اپنی لاجواب شخصیت کے بل پر ایک پراگندہ اقلیت کو ایک مستقل قوم بنانے میں نمایاں طور پر کامیاب ہوئے -

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس سے اسلامی ہند کی تاریخ بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوا چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور میں پاکستان کی قرار داد منظور کی یعنی مسلمانان ہند کے لیے ہندوستان کے ایک حصے میں ایک خود مختار حکومت اور ایک جداگانہ آزاد وطن کے قیام کا شاندار منصوبہ باندھا ۔ اس سے مسلمان قوم میں زندگی کی ایک برقی رو دوڑ گئی اب وہ محض تحفظات و مراعات کی سائل نہ رہی بلکہ ایک علاحدہ مستقل آزاد قومیت کی دعویدار بن گئی جس کی ایک اپنی جدا حکومت ہو ، ایک اپنی جدا تہذیب اور ایک اپنا جداگانہ وطن ۔

پاکستان کی تجویز کے بعد اس منصوبے کو تفصیل سے مکمل کرنے کی ضرورت پیش آئی چنانچہ ۱۹۴۴ء میں معاشی مسئلے پر غور کرنے کے لیے ایک تعمیری کمیٹی وضع کی گئی تعلیمی مسئلے کے لیے ایک تعلیمی کمیٹی بنی اور دیگر اہم مسائل کے لیے مصنفین کی ایک کمیٹی بنائی گئی ۔

۱۹۴۴ء میں پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ وزارت میں جھگڑا پیدا ہوگیا اور بمبئی میں گاندھی اور جناح کی ملاقات ہوئی مگر ناکام رہی ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس میں کانگرس اور لیگ کو پھر اکٹھا بلایا گیا مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا ۔ آخر حکومت ہند نے نئے انتخابات کا اعلان کیا اور کہا کہ نئی برطانوی مزدور حکومت کے پیش نظر ہندوستان کو خود اختیاری حکومت دینا ہے ۔

نئے انتخابات میں جو ۱۹۴۵-۴۶ء کے موسم سرما و بہار میں ہوے ہندوؤں میں کانگرس اور مسلمانوں میں مسلم لیگ پورے طور پر کامیاب ہوگئی ۔ اتنے میں برطانوی حکومت نے ۱۹۴۶ء میں پہلے ایک وفد کو اور پھر ایک "وزارتی مشن" کو ہندوستان بھیجا تا کہ

یہاں کی سیاسی گتھی کو سلجھائے۔ مشن نے ہندوستان کی حکومت کے لیے ایک نئی سکیم پیش کی لیکن مشن کی کانگرس نواز پالیسی سے ناراض ہوکر مسلم لیگ نے اس سکیم کو ٹھکرا دیا اور گو آخرکار وہ بھی مرکز کی عارضی حکومت میں شریک ہوگئی لیکن ادھر نہ صرف کانگرس اور لیگ میں بات بات پر اختلافات رونما ہوے بلکہ ملک بھر میں جابجا ہندو، مسلمانوں میں شدید فرقہ وارانہ مناقشات اور فسادات برپا ہوگئے۔ کانگرس نے مسلم لیگ سے با عزت سمجھوتا کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی حکومت نے پہلے یہ اعلان کیا کہ وہ کسی ایسے دستور کو ملک میں نافذ نہیں کرے گی جس پر دونوں بڑی جماعتوں کا اتفاق رائے نہ ہو اور پھر فروری ۱۹۴۷ء میں یہ فیصلہ کیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان کو خالی کر دیگا۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں پنجاب میں مسلم لیگ کی ایک زبردست تحریک اٹھی۔ جس میں مردوں اور عورتوں نے یکساں حصہ لیا اور جو صرف ایک ماہ جاری رہ کر بہت نتیجہ خیز ثابت ہوئی۔ برطانوی حکومت اس سے متأثر ہوئی اور اسے یقین ہوگیا کہ اسلامیان ہند کے قومی مطالبے کو اب دیر تک معرض التواء میں نہیں رکھا جا سکتا۔ اُدھر پاکستان کے مخالفین نے ملک بھر میں فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ شروع کردیا جو اخیر سال تک جاری رہا اور جس کے ضمن میں ایک منظم سازش کے ماتحت آٹھ دس لاکھ بے گناہ مسلمانوں کو بے رحمی سے تہِ تیغ کر دیا گیا۔ اسی دوران میں برطانیہ نے ۳ جون کو ہندوستان و پاکستان کی آزادی کے متعلق اپنا نیا منصوبہ شائع کیا جس کے مطابق ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو دونوں ملکوں میں دو علئحدہ علئحدہ خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں۔ یوں اسلامی ہند کے دس کروڑ فرزندان توحید کی تنظیم اور قربانیاں پھل لائیں اور مشرق و مغربی ہند میں مشرقی و مغربی پاکستان کی بنیاد پڑی۔

پاکستان کے قیام سے نہ صرف ہندوستان کے برعظیم اور ایشیا

میں بلکہ ساری اسلامی دنیا میں ایک ایسا قوت آفریں تغیر رونما ہو گیا ہے جس کے غیر معمولی نتائج کا دنیا ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتی - ادھر یہ امر پاکستان کی ملت اسلامیہ پر روز بروز واضح ہو رہا ہے کہ اگر اسے اپنی اور دنیا کی طرف اپنا اسلامی اور انسانی فرض ادا کرنا ہے تو پاکستان کی حکومت لازمی طور پر اسلامی جمہوریت کے ترقی پرور اصولوں پر قائم ہو گی جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں سے مساوی سلوک کیا جائے گا جس میں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے لیے جگہ نہ ہوگی بلکہ جس میں غریبوں اور کارکنوں کا خاص طور پر خیال رکھا جائے گا ، جس میں عورت کے حقوق اور اس کی شخصیت محفوظ ہوگی ، جس میں دولت ادھر تمام لوگوں میں مناسب طور پر تقسیم ہو کر اور ادھر بیت المال میں جمع ہو کر عوام الناس کا معیار زندگی بڑھانے کے کام آئے گی -

مسلمانوں کا نصب العین اسلام ہے وہ اسلام نہیں جس کا ڈنکا مطلق العنان بادشاہوں اور خود غرض امراء نے بجایا بلکہ وہ اسلام جس کا حامل قرآن ہے جس نے صرف ان دیکھے خدا کے آگے سر جھکانا سکھایا ، وہ اسلام جس کا نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد میں مسلمانوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے وہ سچائی، وہ دلیری ، وہ خود اعتمادی ، وہ انکسار و امن پسندی ، وہ محنت و مساوات ، وہ صبر و تقوی ، وہ مسلم و غیر مسلم سب کی خدمت سب کے حقوق کا تحفظ ، سب سے رواداری اور محبت ! یہ ہے پاکستان کے مسلمانوں کا نصب العین ہمارے قومی شاعر نے اپنی قوم کے ہر فرد پر خوب روشن کر دیا ہے کہ :

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

رشید احمد صدیقی

(۱۸۹۲ء تا ۱۹۷۷ء)

علامہ اقبالؒ

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

بڑی گرمی پڑ رہی تھی ۔ دور دراز کے سفر سے واپس آ رہا تھا ۔ علی گڑھ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اترا ہی تھا کہ ایک عزیز نے کہا : ڈاکٹر صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ تھوڑی دیر کے لیے کچھ ایسا معلوم ہوا جیسے پلیٹ فارم کی ہر چیز موجود تو ہے لیکن اس کی نہ کوئی آواز ہے اور نہ اس میں کوئی حرکت ۔ یہ بات صرف ایک آن کے لیے تھی ۔ کائنات کا پھیلانے ، پالنے اور پیدا کرنے والا ، پر ہیبت و پر اسرار گراں پیکر پہیا جو آن کی آن رک کر الٹا چلنے والا معلوم ہوتا تھا ۔ اپنے مقرر رخ اور رفتار پر لوٹ گیا ۔ زندگی اپنے تمام ہنگاموں کے ساتھ پھر رواں دواں نظر آنے لگی ۔ مکان واپس آیا نہ نہانا اچھا معلوم ہوا نہ کھانے کو جی چاہا ۔ جیسے نفس اپنے مطالبات چھوڑ بیٹھا تھا ۔ تھوڑی دیر کے لیے کمرہ بند کر کے لیٹ رہا ۔

ذہن نے ماضی کے اوراق ایک ایک کر کے پلٹنے شروع کر

دیے ۔ طفولیت کا زمانہ یاد آیا جب اقبال کے اشعار چھپنے کی دوستی کی طرح مزے دار اور جاں نثار معلوم ہوتے تھے اور اقبال کا تصور تھا کہ وہ جو اشعار کہتے ہیں انھیں میں رہتے بستے ہیں ۔ اقبال کی صورت وہی ہو گی جو میرے اپنے تصورات کے عمل سے پیدا ہوئی تھی ۔ بہت اچھی سی بہت چاہی جانے والی ، جادوگروں جیسی، کچھ عجیب سی ۔ ۱۹۲۵ میں میں مرحوم سے ملنے لاہور گیا تھا ۔ غالباً دن کے نو دس بجے ہوں گے ۔ میں مرحوم کی کوٹھی پر پہنچا ۔ کپڑے پہن کر کسی مقدمہ کی پیروی میں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے ۔ سیاہ عقدہ (بو) باندھتے کالر درست کرتے ہوئے وارد ہوئے ۔ گٹھا ہوا جسم ، چوڑی چکلی ہڈیاں ، مردانہ انداز ، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع کسی قدر تورانیوں جیسی ، سوٹ بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا ۔ مسکرانے میں آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑتی تھیں جن سے ذکاوت و ملاطفت کا اظہار ہوتا تھا ۔ بڑی خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا اور کسی قدر دیر تک ہاتھ میں لیے رہے ۔ بھاری بھرکم لہجے میں بولے ۔ آپ ہیں جی ، صدیقی صاحب ! میں اقرار کرتا ہوں کہ مرحوم کا ڈیل ڈول اور ان کا حلیہ دیکھ کر متحیر اور مرحوم کے انداز تخاطب اور لہجے سے کس قدر دل گرفتہ ہوا ۔ اتنے میں نوکر کو آواز دی ۔ اور پنجابی میں قلم لانے کو کہا ۔ قلم کا تلفظ سن کر میں گھبرا اٹھا ۔ علی گڑھ میں پنجابی تلفظ سے آشنا ہو چکا تھا ۔ لیکن ذہن میں معلوم نہیں کیوں یہ بات جم گئی تھی کہ ڈاکٹر اقبال اس طرح کی معذوریوں سے مستثنیٰ ہوں گے ۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیے تھا وہ نہ ہوا ۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ

ملانے میں شفقت اور ناقابل بیان مروت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا ۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا ۔ ایک نیا تجربہ بڑا اچھا تجربہ حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا ۔ گو اس کا منتظر نہ تھا ۔ جیسے مجھے ایک نئی حس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس کرنے لگتا ۔

تھوڑی دیر کے لیے کمرہ میں آ بیٹھے ۔ علی گڑھ کا حال دریافت فرماتے رہے ۔ آواز بھاری تھی لیکن بلند ہونے کے ساتھ ساتھ زور دار ۔ میں نے اس خود اعتمادی کے ساتھ جس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز متوازی ہوں کم لوگوں کو گفتگو کرتے سنا ہے ۔ علامہ مرحوم کی باتیں سنیے بشرطیکہ وہ بات کرنے پر آمادہ ہو جائیں تو فوراً محسوس ہو گا کہ ان کی باتیں صرف زبان سے نہیں ادا ہوتی تھیں اور وہ صرف اپنے الفاظ اور فقروں پر نہیں بھروسہ کرتے تھے بلکہ وہ باتیں کہیں دور سے اور بڑی گہرائی سے آتی تھیں ۔ ان کی گفتگو حشو و زوائد سے قطعاً پاک ہوتی تھی کہ وضاحت و جامعیت بجائے خود صنائع و بدائع معلوم ہونے لگتی تھیں ۔ گفتگو کرنے میں ان کی آنکھیں نصف سے بھی کچھ کم کھلی رہتی تھیں البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی تھی تو آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں اور چہرے پر خون کی سرخی جھلکنے لگتی تھی ۔

اسی دن شام کو دوسری ملاقات ہوئی ۔ اتفاق سے اس وقت ایک نوجوان شاعر آ گئے جو کچھ دیر تک اپنا فارسی کلام سناتے رہے ۔ ان کی شاعری اور لہجہ دونوں پر جدید ایرانی رنگ غالب تھا پھر اور لوگ بھی آ گئے نوجوان کی گفتگو میں تعلّی زیادہ تھی ۔ ڈاکٹر صاحب کی مسلسل خموشی کسی قدر بیزاری میں تبدیل ہونے لگی تھی کچھ دیر تو بیٹھے رہے اس کے بعد کھڑے ہوئے ، صحبت ختم

ہو گئی - صرف دو چار اصحاب بیٹھے رہ گئے - اندر سے دیر میں برآمد ہوئے ، چہرہ پر اب بھی انقباض طاری تھا - تھوڑی دیر تک حقے کا ٹھہر ٹھہر کر کش لیتے رہے - اس کے بعد فرمایا ، نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے - اس کے بعد کچھ اور لوگ آ گئے - اب طبیعت بحال ہو گئی تھی - ہر ایک سے پرسش حال کرتے ، وہ بھی اس طور پر نہیں کہ موسم اچھا ہے رسمی باتیں تو وہ کرنا جانتے ہی نہ تھے ، ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کا مخصوص دکھ سکھ سنتے - لوگ مرحوم کے حلقے میں معتقدین کی حیثیت سے ڈرے سہمے ہوئے نہیں بیٹھتے تھے بلکہ محبت اور بے تکلّفی کی فضا ہوتی تھی - ہر شخص مرحوم کی باتیں بڑی گہری توجہ سے سنتا اور خود بھی بے تکلفی سے اپنی سناتا -

دوسرے دن پھر مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا - آج کہیں جانا نہ تھا - اس لیے بڑے اطمینان اور بے تکلفی سے باتیں شروع کیں - اس زمانہ میں اقبال کے نظریۂ فوق البشر کا بڑا چرچا تھا - بعض باتیں میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں - اس لیے اس پر میں نے خاص طور پر اپنے شبہات کا اظہار کیا - مرحوم نے بڑے ہی عالمانہ انداز سے اور انتہائی خوش دلی سے اور خود اعتمادی کے ساتھ ، جو ان کی سیرت کا بڑا ہی گراں قدر پہلو تھا ، اظہار خیال کرنا شروع کیا - مجھے اس وقت جو چیز سب سے زیادہ عجیب اور خوش آئند معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ مشکل سے مشکل مسئلے کو مرحوم کس خوبی سے واضح کرتے تھے ، ایسا معلوم ہوتا جیسے متنازعہ فیہ مسئلے میں کوئی پیچیدگی تھی ہی نہیں - مخلصانہ نقطۂ نظر کی یہ کرامت ہے کہ ناگہانی پیچیدگیوں اور نا معلوم مسائل کا حل بڑی آسانی سے سامنے آ جاتا ہے - اس صحبت میں عورتوں کا درجہ ، فوق البشر ، بعثت نبویؐ کا وقت اور مقام ، فقہ اسلامی میں اجتہاد

کے مسائل پر تقریباً تمام دن گفتگو فرماتے رہے - میں نے اس بحث کا خلاصہ اپنے بعض گذشتہ مضامین میں جہاں تہاں کیا ہے لیکن ایک بات جس کا اعادہ میں بار بار کرتا رہا ، وہ یہ ہے کہ مرحوم کو صرف شاعر سمجھ لینا ، یا یہ کہ ان کے خیالات یا تصورات تمام کے تمام ان کے کلام میں مقید ہو چکے ہیں ، بڑی غلطی ہے - مرحوم کی فکر و نظر کا بہت کم حصہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے وہ بہت کچھ جانتے تھے اور یہی نہیں بلکہ اکثر کچھ ایسا بھی محسوس ہوا جیسے بعض بالکل ہی نئی باتیں دوران گفتگو میں ان پر کسی کوشش کے بغیر منکشف ہو گئیں -

فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسئلے پر وہ انگریزی میں بہت کچھ لکھ چکے تھے - مسودہ بھی ٹائپ ہو چکا تھا اور کافی ضخیم تھا - فرمایا ان مسائل پر میں بعض مستند علماء سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتا ہوں ، تمھارے نزدیک کون لوگ ایسے ہیں جن سے رجوع کرنا سود مند ہوگا - میں نے عرض کیا کہ میں اس کوچے سے نابلد ہوں - اس کے علاوہ میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کہ ہمارے بیشتر علما علم دین سے تو پورے طور پر واقف ہوتے ہیں لیکن موجودہ عہد کے اکثر مسائل کچھ ایسے پیچ در پیچ ہوتے ہیں اور ماہرین فن ہی کے پیدا کیے ہوئے ہوتے ہیں - کہ ان پر ہمارے علمائے کرام مناسب رائے قائم کرنے سے معذور رہتے ہیں - جب تک متنازعہ فیہ مسئلے کی ماہیت نہ معلوم ہو اس وقت تک ان پر صحیح حکم لگایا کیسے جا سکتا ہے - میرا خیال ہے کہ آپ کے سامنے جو نوعیت ہے اس پر اگر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب اور مولانا سید سلیمان ندوی صاحب سے رجوع کیا جائے تو بہتر ہو گا - مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ مرحوم نے یہ فرمایا کہ وہ ان دونوں بزرگوں سے تبادلہ خیالات کر رہے ہیں یا کریں گے - اتنا البتہ یاد ہے کہ دونوں کے بارے میں مرحوم نے اچھے خیالات کا اظہار کیا -

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ خطوط کا جواب جلد سے جلد دیتے تھے اور جب تک بینائی نے ساتھ دیا ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجتے - ان خطوط میں رسمی تکلفات کو بالکل دخل نہ ہوتا اور ہر بات کا جواب نہایت واضح اور جامع ہوتا - وہ مشکل سے مشکل اور نازک سے نازک مسئلے میں بھی بڑی صاف گوئی سے کام لیتے - بڑے آدمیوں کی طرح ان میں یہ کمزوری نہ تھی کہ جوابات ایسے ہوں کہ موقع بے موقع کترا کے نکل جانے کا امکان باقی رہے - ان کو اپنے جوابات پر بڑا اعتماد ہوتا - اس کا سبب میں سمجھتا ہوں یہ ہے کہ وہ فلسفی ، مفکر اور مقنّن ہونے کے علاوہ بڑے اچھے وکیل (بیرسٹر) بھی تھے - وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے ، اس میں جذبات کو اتنا نہیں جتنا کہ فکر و تدبُّر کو دخل ہوتا - چنانچہ ان کی تحریر و تقریر دونوں میں ایک اچھے قانون دان اور اچھی وکالت کرنے والے کا منطقی ربط ہوتا -

سن ۱۹۳۰ء میں میں جب بیمار تھا ڈاکٹر صاحب انہیں دنوں ، یاد نہیں آتا ، کس سلسلے میں ، علی گڑھ تشریف لائے تھے - ایک دن صبح مکان پر تشریف لائے - اس روز مجھے خاص طور پر بڑی تکلیف تھی - مشکل سے باہر آیا - میں نے بڑی مایوسی کے ساتھ رک رک کر کہا - ڈاکٹر صاحب کاش میں اتنا بیمار نہ ہوتا کہ آپ کے دوسری جگہ قیام کرنے کی مایوسی اور شرمندگی اٹھانی پڑتی - بارے ان کا وہ چونک کر لیکن فوراً ہی مسکرا کر بڑے وقار اور شفقت سے اپنے مخصوص لہجہ میں فرمانا - "نہیں جی صدیقی صاحب ! کوئی بات نہیں - اللہ اپنا فضل کرے گا اچھے ہو جاؤ گے پھر لاہور آنا ، مایوس کیوں ہوتے ہو - مایوس ہونے سے جانتے ہو ایمان میں خلل پڑتا ہے اور اس سے اللہ کریم کی توہین ہوتی ہے - اچھے مسلمانوں کو اس کی احتیاط رکھنی چاہیے -"

اس کے بعد دیر تک اس انداز سے گفتگو کرتے رہے کہ میں ان کی موجودگی میں یہ بھول گیا کہ بیمار بھی تھا - اس وقت میرے ذہن میں یہ بات آ ہی نہیں سکتی تھی کہ میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور ڈاکٹر صاحب اس جہان سے اٹھ جائیں گے - اکثر یہ خیال آتا کہ ڈاکٹر صاحب جس تکلیف میں مبتلا رہ کر عالم بقا کو سدھارے ، کاش کسی وقت میں حاضر خدمت ہو کر ان کے لیے وہ کر سکتا جو انھوں نے میرے لیے کیا تھا - پھر سوچتا ہوں ڈاکٹر صاحب بہت بڑے شخص تھے - ان کو مجھ جیسا معمولی شخص کیا تسکین یا تشفی دے سکتا تھا - وہ خاصان بارگہ سے تھے - ان کا خدا سے خاص تعلق تھا لیکن اس بات سے طبیعت مطمئن نہیں ہوتی - میں خوب سمجھتا ہوں کہ گو معجزے کا زمانہ نہیں رہا لیکن محبت و خلوص میں اب بھی بڑی کرامتیں پوشیدہ ہیں - دوسروں کی وہ کونسی تکلیف ہے جس کو میں یا آپ محبت سے کچھ اور نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے زائل نہیں کر سکتے -

ڈاکٹر صاحب نے جاوید اور بانو کی تربیت و نگہداشت کے لیے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کر لی تھیں - یہ خاتون میرے ایک عزیز دوست کی رشتہ دار ہیں اور کچھ عرصہ تک میری بیوی بچوں کے ساتھ گھر کے ایک عزیز رکن کی حیثیت سے رہ چکی تھیں - میں نے ہی ڈاکٹر صاحب سے تحریک کی تھی کہ یہ خاتون بچوں کی نگرانی و تربیت و تہذیب میں بہت مفید ثابت ہونگی اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ مدت تک خط و کتابت ہوتی رہی - میں نہیں بتا سکتا کہ مرحوم ان بچوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے کتنے فکر مند تھے - ان کو معاوضے کی کمی بیشی پر مطلق اصرار نہ تھا لیکن وہ خاتون کی سیرت و عقائد کی چھان بین میں اس درجہ کاوش کرتے تھے کہ بالآخر میں نے کسی قدر تھک کر ڈاکٹر صاحب کو لکھ دیا کہ آپ کا نقطۂ نظر

میں پورے طور پر سمجھ چکا ہوں مزید گفتگو سے کہیں بہتر یہ ہو گا کہ آپ امتحاناً انہیں دُو ایک ہفتے کے لیے اپنے ہاں بلا لیں اور ان کے انداز و اطوار کو نظر میں رکھیں - اس کے بعد فیصلہ کرنے میں آسانی ہو گی کہ ان کا رکھا جانا مناسب ہے یا نہیں -

ڈاکٹر صاحب اس تجویز کو مان گئے اور جرمن خاتون، جس کو ہمارے ہاں کے چھوٹے بڑے سب آپا جان کہتے تھے، لاہور پہنچ گئیں - ان کے پہنچنے کے بعد مرحوم کے جو خط آتے ان میں ہر ایک میں ان خاتون کی شرافت و قابلیت دیانت و امانت، محبت و مروت کا ذکر ہوتا - چنانچہ ڈاکٹر صاحب کو ان پر اتنا اطمینان ہوا کہ وفات کے وقت مرحوم نے ان دونوں بچوں کو خاص طور پر ان کے سپرد کیا -

جرمن خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر اقبال کی وفات کے بعد ایک راتِ بانو حسب معمول میری چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی، باتیں کرتی اور خاموش ہو جاتی، پھر باتیں کرنے لگتی لیکن وہ رہ رہ کر کسی ذہنی الجھن میں مبتلا ہو جاتی - میں نے پوچھا، بانو آج کیا بات ہے تم اچھی اچھی باتیں نہیں کرتیں، بانو نے کہا، آپا جان ابا موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے کتنے چمک دار اور اچھے معلوم ہوتے تھے، اب یہ کیوں نہیں چمکتے -

جرمن خاتون نے یہ بھی بتایا کہ خود مرحوم کو بانو سے عشق تھا، چنانچہ بالکل آخری زمانہ حیات میں ڈاکٹر اقبال کا جی صرف بانو سے بہلتا اور بانو بھی مرحوم سے اس طور پر وابستہ ہو گئی تھی جیسے مرحوم اس کی ماں، اس کی ہمجولی اور اس کا کھلونا سبھی کچھ تھے - اسی سلسلے میں خاتون کا بیان ہے کہ جب مرض نے نازک صورت اختیار کرلی اور مرحوم پر ضعف کی وجہ سے اکثر غفلت طاری ہو جاتی، تو ڈاکٹروں نے مریض کے کمرے میں

بانو تک کا آنا بند کر دیا - ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ بانو نہیں معلوم کیسے ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آ گئی جہاں کوئی اور نہ تھا - میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ بانو ڈاکٹر اقبال کے سینے پر بیٹھی ہوئی بے تکلف باتیں کیے جا رہی ہے - میں گھبرا اٹھی - آن کی بینائی تقریباً زائل ہو چکی تھی - میں نے دبے پاؤں قریب جا کر بانو کو بہلا کر جدا کرنا چاہا -

اقبال بول بھی نہ سکتے تھے بڑی ہی نحیف آواز میں کچھ ایسا کہا اور ان کی قریباً بند آنکھوں میں کچھ ایسی جنبش ہوئی جیسے وہ چاہتے تھے کہ بانو کو ذرا دیر کے لیے جوں کا توں رہنے دیا جائے - بانو کے اس طرح موجود ہونے سے جیسے ان پر ایک گونہ اطمینان سا طاری تھا اور زندگی کی ڈوبتی بجھتی ہوئی قندیل کو وہ اپنے جذبہ امتنان و مسرت سے ایک لمحہ کے لیے اور ابھارے اور روشن کیے ہوئے رکھنا چاہتے تھے -

یہ خاتون اب بھی جب کبھی سر اقبال کا تذکرہ کرتی ہیں تو ان کا گریہ گلوگیر ہو جاتا ہے - ان کا بیان ہے کہ میں نے ایسا مخلص اور شریف انسان نہ دیکھا - جب میں پہلے پہنچی تو ڈاکٹر صاحب پورے کپڑے پہن کر آئے اور انھوں نے دستر خوان کے وہ آداب ملحوظ رکھے جو یورپ میں اونچے سے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں - لیکن ان کو مجھ پر کچھ ایسا اعتماد ہوا کہ انھوں نے بڑی صفائی اور بڑے لطف سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو اس تکلف سے مستثنٰی کر دیا جائے - یہاں تک کہ وہ صرف بنیان اور تہمد پہنے کھانے پر چلے آتے - جب تکلیف اور ضعف زیادہ بڑھا تو کمرے ہی میں سے کھانا کھا لیتے - ان میں بھروسہ کرنے کا عجیب مادہ تھا - میری کسی تجویز کو انھوں نے کبھی رد نہیں کیا اور گھر کے معاملات میں مطلق دخل نہیں دیا اور وہ اپنے عزیزوں سے کہیں زیادہ میرا اعتبار کرتے تھے اور مجھے اس بات کا فخر تھا کہ

ڈاکٹر صاحب نے اکثر فرمایا کہ تمھارے ہونے سے مجھے گھر اور بچوں کی طرف سے ایسا اطمینان و آرام ہے جس کا میں بڑا متمنی تھا اور جس کی مجھے بڑی ضرورت تھی۔

دوسرے دن ایک عزیز کے ساتھ مرحوم کے مزار پر حاضر ہوا۔ شاہی مسجد کے پائیں اس مرد قلندر کو آسودہ خاک پایا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہ اس اقبال کی آرامگاہ ہے۔

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے
آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی

میں نے محسوس کیا کہ بادشاہی مسجد کی پر اسرار و پروقار ضخامت و قدامت اور اس کی مخصوص فضا اور روایات ذہن و دماغ پر اس درجہ اور اتنا جلد مستولی ہو جاتی ہیں کہ ذہن کسی دوسری طرف منتقل ہونے کے قابل ہی نہیں رہ جاتا چنانچہ میرے دل میں بے اختیار اور بار بار یہی آیا کہ اقبال کا مزار مستقل حیثیت سے کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ جہاں اقبال کے تصور میں مزاحم ہونے والی کوئی اور چیز نہ ہوتی۔

اقبال زندہ تھے تو اس کا اطمینان رہتا تھا کہ کوئی نہ کوئی موقع نکال کر ان سے مل آؤں گا اور اس کا یقین تھا کہ ان سے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور معلوم ہوگی جو میرے ذہن کی استعداد کو شگفتہ کر دے گی اور دل کے ولولوں کو بڑے ذہن کی کچھ الجھنیں تھیں جن کے بارے میں یقین تھا کہ ڈاکٹر اقبال انھیں سلجھا دیں گے کبھی محنت و مطالعہ سے بچنے کے لیے دل کو بہلا لیا کرتا کہ دماغ پاشی کیوں کی جائے۔ کسی دن ڈاکٹر اقبال سے جا کر اپنا اطمینان کر لوں گا۔

جس وقت وفات کی خبر ملی تو معلوم ہوا کہ تمام ذہنی تصورات جن میں سے بعض دھندلے تھے اور بعض گریز پا اور جن پر تعمیر

کھڑی کر لینا میری زندگی کی کرامات میں سے ہوتا ، اقبال کے اٹھ جانے سے سب کے سب درہم برہم ہوگئے ۔ اب نہ وہ ولولہ رہا کہ ان کا پھر سے تعین کیا جائے اور نہ یہ امید کہ اقبال جیسا رفیق اور رہبر ملے گا جو ان کی تشکیل و تزئین میں مدد دے گا ۔

چراغ حسن حسرت

(۱۹۰۲ء تا ۱۹۵۵ء)

آغا حشر

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلی مرتبہ آغا حشر کا نام کب سنا ؟ صرف اتنا یاد ہے کہ "ڈراما" کا نام سننے سے پہلے اس نام سے میرے کان آشنا ہو چکے تھے - کچھ دنوں کے بعد میری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوا کہ آغا حشر جو کچھ کہتا ہے اس کا نام ڈراما ہے - ڈراما کی اصل کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا - ہاں کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ ڈراما اور ڈرانا کے معنی میں بہت تھوڑا فرق ہو گا -

ہمارے پڑوس میں ایک افغان سردار رہتے تھے - ان کا ایک نوکر تھا جسے سب "آغا آغا" کہہ کر پکارتے تھے - بڑے کلے ٹھلے کا دیدارو جوان تھا - سیاہ گنجان داڑھی - زلفیں چھٹی ہوئیں وہ جدھر سے گزرتا تھا - لڑکے "آغا آغا" کہہ کے اس کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے - وہ اکثر اوقات تو ہنستا ہوا گزر جاتا لیکن کبھی کبھی لڑکوں کے نعرے سن کے چلتے چلتے رک جاتا - اپنی زبان میں چِلّا چِلّا کے کچھ کہتا اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کے ہماری طرف اس طرح دیکھتا کہ سب سہم جاتے -

انھیں دنوں ہمارے قصبے میں ایک اور آغا وارد ہوئے - یہ ہینگ بیچنے آئے تھے - لمبی داڑھی ، بال شانوں پر بکھرے ہوئے صدری پر میل کی تہ جمی ہوئی تھی - وہ ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالے سڑک پر کھڑے رہتے اور "اینگ لے لو - اینگ لے لو" پکارا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی کسی شخص کو ان سے ہینگ خریدتے نہیں دیکھا - کبھی کبھی وہ جھنجھلا کے چِلّا چِلّا کر کچھ کہتے - غالباً بستی کے لوگوں کو جن میں کوئی ہینگ کا قدر شناس نہیں تھا - گالیاں دیتے ہوں گے - اس عالم میں کوئی شخص آ نکلتا تو اسے پکار کے کہتے "خو! اینگ لے لو" اگر وہ چپ چاپ گزر جاتا تو کچھ دیر بک جھک کر خاموش ہو رہتے ورنہ اگر جواب میں کہتا کہ مجھے ہینگ کی ضرورت نہیں تو چِلّا کے فرماتے "خو ام تمھارے باپ کا نوکر ہے کہ تمھارا واسطے اتنی دور سے اینگ لایا - اینگ لے لو - ام سے مسخری مت کرو" -

غرض آغا ، حشر اور ڈراما تینوں لفظ میرے نزدیک بہت ڈراؤنے اور بھیانک تھے اور انھوں نے میرے ذہن پر کوئی خوشگوار اثر نہیں چھوڑا -

پھر جب ہمارے ہاں ایک "ڈرامیٹک کلب" کی بنیاد پڑی اور "اسیر حرص" ، "سفید خون" ، "خواب ہستی" - "ہملٹ" کے نام ہر شخص کی زبان سے سنائی دینے لگے تو آغا حشر کا نام بھی بار بار زبانوں پر آنے لگا - اس دور افتادہ مقام میں لے دے کے یہی ایک تفریح تھی اس لیے بوڑھے ، بچے ، جوان سب تھیئٹر دیکھنے جاتے تھے - مستری خدا بخش سے جو تھیئٹر کے پردے بھی بناتے تھے اور میلوں میں اپنا ہنڈولا لے کر بھی پہنچ جاتے تھے ، سہیلیوں تک جن میں اکثر سکول کے بھاگے ہوئے لڑکے تھے ، میں سب کو جانتا تھا لیکن ان میں آغا حشر کوئی بھی نہیں تھا - مجھے یقین تھا کہ آغا حشر پردوں کے پیچھے کھڑا ہے - اس کا سر چھت سے لگا ہوا ہے -

لمبی داڑھی ہے ۔ گیسو کمر تک پہنچتے ہیں ۔ ایک ہاتھ میں ہینگ کی گٹھڑی ہے ۔ دوسرے میں جادو کا ڈنڈا ۔ اسی کے حکم سے پردے اٹھتے اور گرتے اور ایکٹر بھیس بدل بدل کر نکلتے ہیں ۔ ایک آدھ مرتبہ خیال آیا کہ کسی طرح پردے کے پیچھے جا کر اس کی ایک جھلک دیکھ لوں لیکن پھر ہمت نہ پڑی ۔

پنجاب میں اگرچہ تھیئٹر ، نے چنداں ترقی نہیں کی اور یہاں منشی غلام علی دیوانہ اور ماسٹر رحمت کے کینڈے کے لوگ اس فن میں سند الوقت سمجھے جاتے تھے لیکن ۱۹۲۱ میں جب مجھے پہلی مرتبہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو یہاں آغا حشر کی شاعری کی دھوم تھی ۔ جن لوگوں نے انھیں انجمن حمایت اسلام میں نظمیں پڑھتے دیکھا تھا وہ ان کے انجمن کے جلسے میں آنے اور نظم سنانے کی کیفیت اس ذوق شوق سے بیان کرتے تھے گویا کربلائے معلی کے محرم کا حال بیان کر رہے ہیں ۔ "موج زمزم" اور "شکریہ یورپ" کے اکثر اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے اور انھیں آغا کی طرح مٹھیاں بھینچ کر گونجیلی آواز میں پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تھے ۔

اگرچہ آغا اپنے عروج شباب کے زمانے میں صرف ایک مرتبہ پنجاب آئے لیکن ان کا یہ آنا عوام و خواص دونوں کے حق میں قیامت تھا ۔ یعنی جو ثقہ حضرات ڈراما کو بد وضع اور آوارہ لوگوں سے مخصوص سمجھتے تھے ان کی رائے اس فن کے متعلق بدل گئی اور کیوں نہ بدلتی ؟ اسی گروہ کے ایک شخص نے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں ، جو ان دنوں ایک قومی میلہ سمجھا جاتا تھا ، ایسی نظم پڑھی کہ روپے پیسے کا مینہ برس گیا ۔ اور جو کام بڑے بڑے عالموں سے نہ ہو سکا اس نے کر دکھایا ۔

میں ۱۹۲۵ءمیں کلکتہ گیا تو آغا صاحب کلکتہ چھوڑ مہاراجہ ٹکاری کے ہاں جا چکے تھے ۔ لیکن ان کے ہزاروں مداح

ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کلکتہ میں موجود تھے - ان کی زبانی آغا کی زندگی کے اکثر واقعات ان کے لطیفے ، اشعار ، پھبتیاں سنیں - کوئی سال بھر کے بعد ایک دن کسی نے آکر کہا کہ آغا آئے ہیں - فائن آرٹ پریس والے لالہ برج لال اروڑا آغا کے بڑے عقیدت مند تھے - میں نے ان سے پوچھا کہ "آغا آ گئے- ان سے کب ملوائیے گا ؟-" وہ کہنے لگے - ابھی چلو نیکی اور پوچھ پوچھ - میں نے رسالہ "آفتاب" کے کچھ پرچے بغل میں دبائے - لالہ برج لال نے ٹوپی ٹیڑھی کر کے سر پر رکھی اور بخطِ مستقیم آغا کے ہاں پہنچے - وہ ان دنوں سکی سٹریٹ میں رہتے تھے - بڑا وسیع مکان تھا - ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہی صحن تھا - اس کے دہنے بائیں کمرے - لالہ برج لال نے ان کے نوکر سے پوچھا "آغا صاحب کہاں ہیں ؟" اس نے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا - صحن سے ملا ہوا ایک وسیع کمرہ تھا - اس میں ایک چارپائی پر آغا صاحب صرف لنگی باندھے اور ایک کرتا پہنے لیٹے تھے - ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے - اب جو دیکھتا ہوں تو ہینگ والے آغا اور اس آغا میں زمین و آسمان کا فرق ہے - سر پر انگریزی فیشن کے بال ، داڑھی منڈی ہوئی ، چھوٹی مونچھیں ، دُہرا جسم ، سرخ و سپید رنگ ، میانہ قد ، ایک آنکھ میں نقص تھا ، محفل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں - بڑے تپاک سے ملے - پہلے لالہ برج لال سے خیر و عافیت پوچھی - پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور ادبی ذکر و اذکار چھڑ گئے -

آغا صاحب نے اگرچہ ہزاروں کمائے اور لاکھوں اڑائے لیکن ان کی معاشرت ہمیشہ سیدھی سادی رہی - مکان میں نہ نفیس قالین تھے نہ صوفے نہ کوچ ، نہ ریشمی پردے نہ غالیچے - نفیس کپڑے پہننے کا بھی شوق نہ تھا - گھر میں ہیں تو لنگی باندھے - ایک بنیان پہنے - کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں - باہر نکلے ہیں تو ریشمی

لنگی اور لمبا کرتا پہن لیا - میں نے پہلی مرتبہ انھیں اسی وضع میں دیکھا اور زندگی کے آخری ایام میں جب لاہور آئے ان کی یہی وضع تھی - ہاں اکثر لوگوں سے اتنا سنا ہے کہ لاہور آنے سے پہلے وہ کلکتہ میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے -

آغا بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج شخص تھے جس محفل میں جا بیٹھتے تھے سب پر چھا جاتے تھے - ان کے ملنے والوں میں اکثر لوگ ضلع جگت میں طاق اور پھبتی میں مشاق تھے اور جب شام کو صحبت گرم ہوتی ، تین تین چار چار آدمی مل کے آغا پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھ دیا کرتے تھے لیکن آغا چومکھی لڑنا جانتے تھے - حریف دم بھر میں ہتھیار ڈال دیتا لیکن آغا کی زبان نہ رکتی تھی - اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بانکا پھکیت سروہی کے ہاتھ پھینکتا چلا جا رہا ہے - کبھی کمر کو بتا کے سر پر وار کیا - کبھی پالٹ کا ہاتھ مارا - کبھی دہنے سے کبھی بائیں سے - اس فن میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا -

وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے - ادنٰی قسم کے بازاری ناولوں اخباروں رسالوں سے لے کر فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کی اعلٰی تصانیف تک سب پر ان کی نظر تھی - اور فضل بک ڈپو سے دارالمصنفین تک وہ سارے اداروں کی سرپرستی فرماتے تھے - کلکتہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ سہ پہر کو گھر سے نکلے اور بخطِ مستقیم اخبار "عصر جدید" کے دفتر میں پہنچے - پہلے سارے اخبار پڑھے - پھر رسالوں کی نوبت آئی - کبھی ریویو کے لیے کوئی کتاب آ گئی ، تو وہ بھی آغا صاحب کی نذر ہوئی - کچھ اخبار اور رسالے تو وہیں بیٹھے بیٹھے دیکھ لیے ، جو بچ رہے ، انھیں گھر لے گئے - بازار میں چلتے چلتے کتابوں کی دکان نظر آ گئی - کھڑے ہو گئے - اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کے بغل میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے - راستے میں کسی کتاب کا کوئی گرا پڑا ورق دکھائی

دیا تو اسے اٹھا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالا ۔ نوکر بازار سے سودا سلف لے کر آیا ہے ۔ بنیے نے اخباروں اور کتابوں کے اوراق میں پڑیاں باندھ کے دی ہیں ۔ یکایک آغا صاحب کی نظر پڑ گئی ۔ نوکر سے پوچھ رہے ہیں ۔ اس پڑیا میں کیا ہے ؟ شکر ! اچھا شکر ڈبے میں ڈالو ۔ پڑیا خالی کرکے لاؤ ۔ اسے کہیں پھینک نہ دیجیو ۔ یہ بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے ۔ خدا جانے کسی اخبار کے ورق ہیں یا کتاب کے ۔ بہر حال مجھے ان پر شبلی کا نام لکھا نظر آیا ہے ۔

مطالعے سے ان کے اس شغف کا حال سن کر شاید بعض لوگوں کا خیال ہو کہ آغا نے بہت بڑا کتب خانہ جمع کر لیا ہو گا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ چھوڑ ان کے ہاں دس پانچ کتابیں بھی نہیں تھیں ۔ ایک تو ان کا حافظہ بہت اچھا تھا ۔ ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتے تھے تو اسے دوسری مرتبہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی ۔ دوسرے ان کی طبیعت علائق سے گھبراتی تھی ۔ کتابیں سینت سنبھال کے رکھنے کے جھنجھٹ میں کون پڑے ۔ ان کا تو بس یہ حال تھا کہ کتاب آئی ۔ پڑھ کے مکان کے کسی گوشے میں ڈال دی کوئی ملنے والا آیا اور اٹھا کے لے گیا ۔

یہ اسی مطالعے کی برکت تھی کہ ان کی معلومات پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی ۔ طب ہو یا فلسفہ ۔ شاعری ہو یا ادب ۔ کسی موضوع میں بند نہیں تھے اور جہاں علم ساتھ نہیں دیتا تھا وہاں ان کی ذہانت آڑے آ جاتی تھی ۔ بازار سے نئی جوتی منگوائی ہے کسی نے پوچھا آغا صاحب کتنے کو مول لی ہے ؟ بس آغا صاحب نے جوتی کے فضائل اور محاسن پر تقریر شروع کر دی ۔ چمڑے کی مختلف قسموں ، دباغت کے طریقوں ، جوتی کی وضع قطع ایک ایک چیز پر اس تفصیل سے بحث کر رہے ہیں گویا کسی نہایت اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے ۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد

جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو سننے والوں کو یہ احساس تھا کہ آغا صاحب کی جوتی کو سچ مچ تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

آغا مناظرہ کے میدان کے شیر تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے۔ سب پر چھا جاتے تھے۔ باقاعدہ تعلیم تو واجبی تھی، لیکن مطالعے نے انھیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ایک دن میں نے کہا آغا صاحب جی چاہتا ہے آپ کے سوانح حیات لکھ ڈالوں۔ کہنے لگے میرے سوانح حیات میں کیا پڑا ہے۔

بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وطن میں ان پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ امرت سر اٹھ آئے۔ وہاں سے والد مرحوم شالوں کی تجارت کے سلسلہ میں بنارس پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ ہر چند انھوں نے میری تعلیم میں سعی کی لیکن جی نہ لگا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر چھوڑ دیں۔ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے اور مجھے ملائے مکتبی بنانا چاہتے تھے لیکن مجھے ملائیت سے نفرت تھی۔ ابھی مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ بنارس سے بھاگ کر بمبئی پہنچا۔ وہاں پارسیوں نے تھیٹر کا ایسا طلسم باندھ رکھا تھا کہ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس پر غش تھے۔ میں نے بھی ڈراما لکھنے کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک دو ڈرامے لکھ کر شکسپیئر پر ہاتھ صاف کیا۔ اگرچہ ان دنوں بمبئی میں بڑے بڑے انشا پرداز اور شاعر موجود تھے لیکن خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں میں سب گرد ہو گئے"۔ لو میرے سوانح حیات کا بہت بڑا حصہ تو چند لفظوں میں ختم ہو گیا۔

اکثر لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی کہ آغا خود اپنی تعریفیں کرتے ہیں اور اپنے سامنے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں لیکن آغا صاحب کا خیال تھا کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی تعریف کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی اخبار میں میری ایک نظم جو غالباً عید کے متعلق تھی شائع ہوئی۔ آغا

نے اخبار دیکھا تو نظم کی بڑی تعریف کی ۔ خصوصاً آخری شعر کئی مرتبہ پڑھا اور پھر بولے "اماں ۔ تم بہت خوب کہتے ہو ۔ اس سے اچھا کوئی کیا کہے گا"؟ میں نے کہا آغا صاحب آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں ۔ میں کیا اور میری نظم کیا" ۔ کہنے لگے" کیا کہا ؟ ہم تعریف کرتے ہیں اور تم اپنی مذمت سننا چاہتے ہو ۔ اچھا صاحب ۔ یوں ہی سہی ۔ نظم بہت بری ہے ۔ تم نے جھک مارا جو یہ نظم لکھی اور ہم نے جھک مارا جو تمھاری تعریف کی ۔ کہو کہو ۔ اس ہیچ مدان ، پنبہ دہان ، کج مج زبان ، حقیر فقیر سراپا تقصیر کو کیا شعور ہے کہ نظم لکھ سکے ۔ حضور کی ذرہ نوازی ہے ۔ اور سیدھی سادی زبان میں یہ مضمون ادا کرنا چاہو تو کہو میں نے یہ نظم نہیں لکھی اور تم جھوٹے ہو جو اس کی تعریف کر رہے ہو ارے بھائی ۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تمھارے انکسار کا یہی حال رہا تو فاقے کرو گے ۔ سینہ تان کے کیوں نہیں کہتے کہ جی ہاں ، میری نظم تعریف کے قابل ہے ۔ میں تو یہی کرتا ہوں ۔" ترکی حور" لکھ کے رستم جی کو سنایا ۔ سب نے واہ وا کی ۔ لیکن سرگوشیاں بھی برابر ہو رہی تھیں ۔ حریف اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو ایسی اکھیڑ ماریں کہ آغا چاروں شانے چت جا گرے ۔ اتنے میں کڑک کے کہا ۔ کون ہے جو آج ایسا ڈراما لکھ سکے ؟ یہ سن کے سب کے سر جھک گئے ۔ اور ہر طرف سے آوازیں آئیں ۔ پیر و مرشد بجا و درست ۔

آغا سے یہ بات سن کے مجھے ہمیشہ کے لیے کان ہو گئے ۔ اگرچہ میں ان کی طرح اپنی تعریفیں آپ نہیں کرتا لیکن کوئی تعریف کرے تو یہ بھی نہیں کہتا کہ حضرت میں تو بالکل جاہل ہوں ۔

آغا ہاتھ کے سخی تھے اور دل کے صاف ۔ ان کے ملنے والوں

میں ہر قسم کے لوگ تھے - تھیٹر کے ایکٹروں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے لے کر بڑے بڑے اہل علم تک سب سے ان کی بے تکلفی تھی اور وہ ان سب سے بڑے خلق اور مروت کے ساتھ پیش آتے تھے - ان کے چھوٹے بھائی آغا محمود کو یہ بات ناگوار تھی کہ آغا چھوٹی امت کے لوگوں سے کیوں بے تکلفی سے ملتے ہیں لیکن ان کے جن لوگوں سے جس قسم کے تعلقات تھے ، انھیں مرتے دم تک نبھائے چلے گئے اور وضع داری میں فرق نہ آنے دیا - وہ ہر شخص سے اس کی لیاقت اور مذاق کے مطابق گفتگو کرتے تھے - عالموں میں بیٹھے ہیں تو حدوث و قدم مادہ کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے یا احادیث کی حیثیت پر بحث کر رہے ہیں - اسلام ، عیسائیت اور آریہ سماج کے اصولوں پر تقریریں کی جا رہی ہیں - ایکٹروں میں جا پہنچے تو ضلع جگت شروع ہو گئی - پھبتیاں کہی جا رہی ہیں - قہقہے اڑ رہے ہیں -

آغا نے اگرچہ لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی اڑائے لیکن وہ تنہا خوری کے عادی نہیں تھے - جب روپیہ آتا تھا اس میں سب عزیزوں کے حصے لگائے جاتے تھے - قریب کے رشتہ داروں کو تو انھوں نے ہزاروں لاکھوں دے ڈالے - والدہ کی ایسی خدمت کی کہ کوئی کیا کرے گا لیکن دور کے رشتہ داروں کو بھی وہ کبھی نہ بھولے - ان کے عزیزوں میں کئی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے تھے - ان سب کے درماہے مقرر تھے - روپیہ آتا تھا تو جس کا جو حصہ مقرر تھا اسے گھر بیٹھے پہنچ جاتا تھا - غرض آغا کی ذات کئی بیکسوں کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی - ان کے اٹھتے ہی یہ سہارا مٹ گیا -

آغا کے کلام اور ان کے ڈراموں پر تبصرہ کرنا میرا فرض نہیں - البتہ اتنا ضرور کہوں گا وہ شعر بہت جلد کہتے تھے - مولانا ظفر علی خان کے بعد اگر میں نے کسی کو اس قدر جلد

شعر کہتے دیکھا تو وہ آغا تھے ۔ ڈراموں کا بھی یہی حال تھا اصل میں انھیں لکھنے سے نفرت سی تھی ۔ عمر بھر کبھی کسی کو خط کا جواب نہیں دیا اور جواب دیا بھی تو اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا ۔

کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ میں نے ایک مصرع پڑھا ۔ انھوں نے برجستہ دوسرا مصرع کہہ دیا ۔ اور چند منٹوں میں غزل ہو گئی ۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص سرمستی اور جوش ہے جو اردو میں ان کے سوا کسی کے ہاں نظر نہیں آتا ۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا اثر ان کے ڈراموں پر بھی پڑا ہے ۔ یعنی جس طرح غزل میں ہر شعر مستقل حیثیت رکھتا ہے اسی طرح ان کے ڈراموں کے مختلف اجزا تو اپنی اپنی جگہ خوب ہیں ۔ لیکن آپس میں مل کر وہ اپنا حسن کسی حد تک کھو بیٹھے ہیں ۔ گویا یوں کہنا چاہیے کہ آغا کے ڈراموں کا حسن اجزا میں ہے کل میں نہیں ۔ اسی مفہوم کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مکان کا گارا ، چونا ، اینٹیں اور لکڑی تو اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں لیکن جب ان سے مل کر مکان بنتا ہے تو اس میں بہت سے نقص نظر آتے ہیں ۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھوں نے اردو ڈرامے کو بہت اونچے مرتبے پر پہنچا دیا اور اس معاملے میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا ۔

وہ خود بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ میں لوگوں کے مذاق کو ملحوظ رکھ کر ڈرامے لکھتا ہوں ورنہ اگر میں عوام کے مذاق کی پروا نہ کرکے اپنے اصلی رجحان طبیعت کے مطابق کچھ لکھوں تو اور ہی عالم نظر آئے ۔ میں نے ایک مرتبہ کہا کہ آغا صاحب آپ اپنی طبیعت کے حقیقی جوش کو ظاہر کیوں نہیں ہونے دیتے اور عوام کے مذاق کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں ؟ یہ سن کر آغا کے ابرو پر بل پڑ گئے ۔ اور کہنے لگے کہ اگر میں اپنی طبیعت کے صحیح رجحان کی پیروی کرتا تو جوتیاں چٹخاتا پھرتا ۔

وہ تو بڑی خیر گزری کہ میں نے زمانے کی نبض کو پہچان لیا ۔ لوگوں کے مذاق کے مطابق ڈرامے لکھتا ہوں ۔ اور موٹروں میں اڑا پھرتا ہوں ۔

۱۹۲۸ کے اواخر میں آغا حشر ٹکاری سے کلکتہ آئے ہوئے تھے کہ ایک دن میں ان سے ملنے گیا پہلے تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے ۔ پھر کہنے لگے ارے میاں اس اخبار نویسی میں کیا پڑا ہے ۔ اسے چھوڑو اور میرے ساتھ ٹکاری چلو ۔ ڈراما لکھنے میں برق نہ کر دوں تو میرا ذمہ ۔ میں نے اس وقت تو کہہ دیا کہ اچھا آغا صاحب یوں ہی سہی ۔ مگر گھر آ کے سوچا تو خیال آیا کہ اب تو آغا صاحب سے نیاز مندانہ تعلق ہے ۔ ملازمت کا قصہ ہو گا تو اور بات ہو جائے گی ۔ کیا عجب کہ کسی بات پر ان سے بگڑ جائے اور جو صاحب سلامت آج ہے یہ بھی نہ رہے لیکن مشکل یہ تھی کہ آغا سے اقرار کر چکا تھا اب انکار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ اتفاقاً اسی درمیان کچھ ایسے پیچ پڑے کہ میں نے کلکتہ چھوڑ لاہور آنے کا تہیہ کر لیا ۔ چلنے سے پہلے ایک دن آغا سے ملنے گیا ۔ مجھے دیکھتے ہی بولے ٹکاری چلتے ہو نا ؟ میں نے کہا ۔ میں تو لاہور جانے کا ارادہ کر چکا ہوں ۔ وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے ۔ میرے ساتھ لاہور اور لاہور کے اخباروں اور اخبار نویسوں کو بھی لے ڈالا ۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا ۔ پھر اٹھ کر چلا آیا ۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ آغا ٹکاری چلے گئے ۔

کوئی سات سال کے بعد پھر آغا سے لاہور میں ملاقات ہوئی ۔ میں حکیم فقیر محمد مرحوم کے ہاں ملنے گیا تو وہ چھ سات آدمیوں میں گھرے بیٹھے تھے لیکن میں نے بالکل انہیں نہیں پہچانا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے ۔ گالوں میں گڑھے ، ہڈیاں نکلی ہوئیں ، گردن کا گوشت لٹکا ہوا ۔ پہلے کچھ دن حکیم صاحب کے ہاں

ٹھہرے - پھر شہر کے باہر ایک کوٹھی کرایہ پر لی اور وہاں اٹھ گئے - میں کبھی کبھی وہاں جاتا تھا - اگرچہ اب بھی ان کی طبیعت اور وضعداری کا وہی عالم تھا لیکن جہاں انہیں امراض نے آ گھیرا تھا وہاں طبیعت میں وہ اگلی سی جودت بھی نہیں رہی تھی -

ایک دن میں میکلوڈ روڈ سے گزر رہا تھا کہ کسی نے آواز دی - مڑ کر کیا دیکھتا ہوں کہ آغا صاحب ایک دکان کے سامنے بیٹھے ہیں - میں نے پوچھا - "آپ یہاں کہاں" فرمانے لگے " موٹر خراب ہو گئی ہے - اس کی مرمت کرانے یہاں بیٹھا ہوں -" پھر بولے "یہ کیا حرکت ہے - تم ہمارے ہاں آتے کیوں نہیں" میں نے کہا "آغا صاحب فرصت نہیں ملتی - بولے : چل چلاؤ لگ رہا ہے - ہم مر جائیں گے تو افسوس کرو گے - کہ آغا سے اس کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی نہ ملے - "میں نے کہا "آغا صاحب کل ضرور حاضر ہوں گا- فرمانے لگے "آج تو میں امرت سر جا رہا ہوں- پرسوں واپس آ جاؤں گا - مجھے فون کر لینا"-

دوسرے دن فون کیا تو معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی نہیں آئے - تیسرے دن رات کے وقت کسی نے کہا - کہ آغا صاحب سخت بیمار ہیں - میں نے سوچا کہ اس وقت تو ان سے ملنا مناسب نہیں - صبح چلیں گے - صبح میں اٹھ کر کپڑے پہن رہا تھا - اتنے میں خبر ملی کہ آغا کا انتقال ہوگیا ہے - اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن -

لوگوں کا خیال تھا کہ جنازہ شہر میں لایا جائے گا - اخباروں میں یہ خبر بھی چھپی کہ نیلے گنبد میں نماز جنازہ ہو گی - لیکن پھر خدا جانے کیا ہوا - کہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا - جنازہ کے ساتھ سو سوا سو آدمی تھے - ان میں بھی یا تو ان کی فلم کمپنی کے لوگ تھے - یا بعض بعض خاص نیازمند کوئی دس بجے جنازہ اٹھا اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے انھیں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا -

محمد حسین آزاد

(۱۸۳۰ء تا ۱۹۱۰ء)

ایران کے موسم[1]

بہار نو روز : آفتاب آخر حوت پر پہنچا اور موسم میں تبدیلی نظر آئی - دل گھبرانے لگتے ہیں - آمد بہار کی تاثیر سے زمین سانس لیتی ہے - در و دیوار کے مسامات سے گرمی نکلتی معلوم ہوتی ہے ...... پھر چند روز کے بعد کچھ اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ در و دیوار میں پسینہ سا بہتا ہے ...... ساتھ ہی بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے - ۲۱ یا ۲۲ مارچ کو نو روز ہوتا ہے - یا تو درختوں پر پتوں کا نام نہ تھا ، سب شاخ بلور بنے کھڑے تھے اور زمین آسمان برف ہی برف نظر آتے تھے - یا برف باری موقوف ہو جاتی ہے- آٹھ دس دن کے بعد کبھی ایک ہلکا سا جھالا پڑ گیا ، ورنہ برف بر طرف ، زمستان موقوف - جہاں ہوتی ہے پانی ہوتی جاتی ہے - نہریں ، حوض ، تلاؤ وغیرہ بلکہ اکثر دریا

---

۱ - مولانا آزاد لکھتے ہیں : ایران میں چار موسم ہیں :-

۱ - بہار = ۲۱ مارچ سے ۲۱ جون تک (برج) حمل - ثور - جوزا

۲ - گرمی = ۲۱ جون سے ۲۱ ستمبر تک (برج) سرطان - اسد - سنبلہ

۳ - خزاں = ۲۱ ستمبر سے ۲۱ دسمبر تک (برج) میزان - عقرب - قوس

۴ - جاڑا = ۲۱ دسمبر سے ۲۱ مارچ تک (برج) جدی - دلو - حوت

کہ جم کر آئینہ ہو گئے تھے وہ پگھلنے لگتے ہیں - نہروں کی نالیوں میں چپکے چپکے پانی سر سرانے لگتا ہے - پھر حوضوں کے اوپر کا تختہ کنارے کنارے پگھل جاتا ہے - گویا حوض نے ذہن کھول دیا - کناروں پر سبزہ اور سبزے پر کلیاں آ جاتی ہیں - ...... زمیندار اپنے کھیتوں پر آتے ہیں - باغ والے باغوں میں پہنچتے ہیں باغیچے سب کے پاس ہیں - بعض کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے خانہ باغ ہیں - غریب اپنے دوست آشناؤں کو لے کر انگور کی داربستیں باندھتے ہیں - درختوں کو چھانٹتے ہیں - کیاریاں صاف کرتے ہیں - درخت جو سوکھی جھاڑیاں نظر آتے تھے ، ان میں پھر جان آتی ہے - اس طرح کہ آج صبح کو دیکھا ، ٹہنیوں پر برف نہیں رہی ، کل صبح کو دیکھا تو سبزی تحریر معلوم ہوئی - دوسرے دن دیکھا تو ہری ہری کونپلیں ، مگر سبزی بھی ایسی شفاف کہ آنکھوں میں طراوت آئے - جس درخت کی طرف دیکھو زمرد کی ٹہنیاں بن گئیں - آٹھ دس دن میں ہرا بھرا درخت لہلہا رہا ہے - باغ و گلزار میں بلکہ گھر گھر کی کیاریوں میں گلاب کھل گیا ہے - درو دیوار پر سبزہ خود رو بھی آگا تو ایک گل خود رو لیے آگا - لوگ گھروں میں سکڑے بیٹھے تھے ، نکل کھڑے ہوئے - بند کام جاری ہوگئے - آسودہ حال لوگ گھوڑوں پر چڑھے - دوست آشناؤں کو لے کر باغوں میں گئے - بہاریں منائیں - عورتیں بھی باغوں اور کھیتوں میں گئیں اور دل خوش کرنے لگیں ......

ادھر گلاب کھلا - ادھر بلبل ہزار داستاں اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی - بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے چہچہے کرتی ہے - گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے بولتی ہے - بولتی ہے —— حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے

زمزمہ کرتے رہ جاتی ہے—— تب معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں ۔ وہاں گھروں میں نیم کیکر کے درخت تو ہیں نہیں سیب ، ناشپاتی ، بہی ، انگور کے درخت ہیں ۔ چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آن بیٹھتی ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا شروع کرتی ہے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے ۔ وہ بولتی ہے اور زمزمے میں تانیں لیتی ہے اور اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقع پر جب چہہ چہہ چہہ کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا ۔ اہل درد کے دلوں میں سن کر درد پیدا ہوتا ہے اور جی بے چین ہو جاتے ہیں ۔

میں ایک فصل بہار میں اسی ملک میں تھا ۔ چاندنی رات میں صحن کے درخت پر آن بیٹھی تھی اور چہکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا ۔ کیفیت بیان میں نہیں آ سکتی ۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اڑا دیا ۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے ۔ چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا ، ہم طبع ، ہم نفس زندہ دلی کی امنگ میں آ کر کہتے ہیں "بیائید امشب شب گل کنیم"۔ باغ جاتے ہیں ۔ رات کو وہیں رہتے ہیں بہار مناتے ہیں اور زندگی کی بہاریں لوٹتے ہیں ۔

گرمی : گرمی کا موسم آیا ۔ رستے برف سے پٹے پڑے تھے سب کھل گئے ۔ کارواں تیار ہوے ۔ سوداگروں نے دساور باندھے کاریگروں کے کارخانے جاری ہوے ۔ درختوں پر میوے دانے ہرے دکھائی دینے لگے ۔ پہاڑوں پر برفیں پگھلتی ہیں ۔ جہاں باقی ہیں ، سبز مخمل پر سفید چادریں بچھی ہیں ۔ چشمے بہ نکلتے ہیں ۔ دریا چڑھاؤ پر آ کر زور شور دکھاتے ہیں اور موجیں مارتے چلے جاتے ہیں ۔ نہریں بہتی ہیں ۔ پانی کی چادریں اس زور سے

گرتی ہیں کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی - جگہ جگہ پن چکیاں چلنے لگتی ہیں - پانی آگے بڑھ کر آبادیوں میں آتے ہیں - گھر گھر گنگا بہتی ہے - کھیتیاں دھوپ کی گرمی سے روز بروز زرد ہوتی ہیں ہوا کی قدرتی خشکی دنوں کی جگہ گھڑیوں میں سکھاتی ہے ، اور جھٹ پٹ کاٹنے کے قابل کر دیتی ہے - باہر کسان کھیت کاٹ ، اناج نکال کر ٹھکانے لگاتے ہیں - آپ چند روز دم لیتے ہیں اور زمین کو بھی دم لینے دیتے ہیں کہ آئندہ فصل کے مسافروں کے کے لیے تازہ دم ہو جائے -

باغوں میں میوے پک کر تیار ہو جاتے ہیں - بازاروں میں با سلیقہ دکاندار ایسی خوبصورتی سے دکانیں سجاتے ہیں کہ گویا نعمت الٰہی کا نگارخانہ کھلا - سیب ، ناشپاتی ، بہی ، انگور رنگا رنگ بو قلموں - گھروں میں کوئی گھر خالی نہیں دو دو چار چار قسم کے درخت موجود ہیں - آپ میوے توڑتے ہیں ، کھاتے ہیں ، کھلاتے ہیں - باغ والوں کے گھروں میں باغوں سے کٹ کر میوے آتے ہیں - میوہ خانے کے حجروں میں ، انگور ، خربوزے ، تربوز لٹکاتے ہیں کہ قندیلیں قمقمے نظر آتے ہیں —— سیب ، بہی ، ناشپاتیاں ، اتنی ہوتی ہیں کہ دنبے اور بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں - زمین کھود کھود کر ایک ایک تہ بھس کی دیتے جاتے ہیں اور تہ بتہ جماتے جاتے ہیں - ہوا کی لطافت اور پاکیزگی یہ ہے کہ سڑنے نہیں دیتی بلکہ پرورش کرتی ہے - گرم ملکوں کے لوگ اپنی اپنی اجناس لے کر ٹھنڈے ملکوں کی طرف بیچنے نکل جاتے ہیں کیوں کہ سیاحت وہاں کی ملکی رسم ہی نہیں ، باعث زندگی ہوگئی ہے - شہروں میں بازار گرم ہوتے ہیں بھیڑ بھاڑ سے رونق ہو جاتی ہے - جا بجا مرزا منش ، خوش پوشاک خوش وضع لوگ ، خوبصورت لوگ پھرتے ہیں -

گرمی کا موسم اس ولایت میں بند کاموں کو کھولتا ہے -

منافع کو پھیلاتا ہے اور عموماً گرمی آسائش و آرام کا سامان ہے......
اگرچہ وہاں کی گرمی ایسی ہے جیسا یہاں کا گلابی جاڑا ۔ لیکن اکثر گرم میوے اور دنبوں کے گوشت کھاتے ہیں ۔ یخنیاں اور چائیں پیتے ہیں اس لیے مزاجوں کو گرمی کی برداشت نہیں ۔ تھوڑی دیر چلتے پھرتے ہیں ، پسینے پسینے ہو جاتے ہیں ۔ دکاندار پہاڑوں سے برف کے ڈھیمے کاٹ کر لاتے ہیں ۔ فالودے کی دکانیں سجاتے ہیں ۔ تم نے پیسا دو پیسے دیے ۔ اُس نے کٹورے میں تھوڑا شربت انگور ، تھوڑا برف کا لچھا ڈالا اور حوالے کیا......

خزاں : آفتاب میزان میں آیا ۔ جاڑے کا پیام لایا ۔ یخ بندیاں شروع ہو گئیں ۔ پہاڑوں پر چشمے بند ہو گئے ۔ دریا اترنے لگے ۔ نہریں سوکھنے لگیں ۔ کہیں پانی ہے تو اتنا کہ اوپر انگل دو دو انگل برف کی پپڑی ، نیچے پانی بہتا چلا جاتا ہے ۔ اول اول پپڑی کو مکا مار کر توڑا ، پانی بھر لے گئے ۔ پھر محلوں میں حوض بھر لیتے ہیں ۔ وہ سب یخ ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ اُن سے اور آب انباروں کے پانی سے کام چلتے ہیں ۔

یخ بندیاں دیکھتے ہی کسان زمین جوت کر بیج بو دیتے ہیں ۔ اسی عرصہ میں برف کے آثار نظر آنے لگتے ہیں ۔ سب کھیتوں اور باغوں کو چھوڑ کر گھروں کا رخ کرتے ہیں ۔ جو بیج بوئے تھے خدا کے سپرد یا برف کے حوالے —— وہ قدرتی دائی آپ ہی بچے نکالے گی ، آپ ہی پالے گی......

موسم خزاں میں کھیتوں اور باغوں میں اداسی کا عالم ہوتا ہے ۔ غرض باہر کے کام والے شہروں میں آئے ۔ پوستین ، لحاف ، توشک ، انگیٹھیاں ، آتشدان گھر گھر میں موجود ہیں ۔ ضروری سامانوں کے ذخیرے بھرے ہیں ۔ میوہ خانوں میں تر و خشک میوے دھرے ہیں ۔ دنبے کے دنبے یلمہ کیے ہیں اور نمک سود کر کے لٹکا دیے ہیں ۔ گوشت قاق تیار ہیں ۔ یخنیاں اور شب دیگیں

پکائیں گے - پلاؤ دم دیں گے اور گھروں میں بیٹھے کھائیں گے -

اتنے میں ہوا جاڑے کی سواری لائی - سناٹے چلنے لگے - دیکھتے دیکھتے کیا باغ کیا جنگل تمام درخت زرد ہو گئے اور زردی بھی وہ کہ گویا عالم زعفرانی ہوگیا بعض درختوں کے پتے ایسے سرخ ہو جاتے ہیں جیسے تپایا ہوا تانبا -

جاڑا : دفعةً ہوا بند ہوئی ابر سا گھر آیا - دنیا دھواں دھار ہو گئی پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا - تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر ، کوٹھوں پر ، دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا - غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا - رات گزری - صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا - دوسرے دن ایک جھکولا اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا - پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں - جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے - وہ بھی سیاہ رنگ جیسے بجلی مارا لوہا - ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہوئی مگر کس طرح جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دھنک رہا ہے - ایک دن رات جو برف کا تارنگا تو درو دیوار ، زمین آسمان تمام سفید - وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشے کی شاخیں ہو گئیں......

پہاڑیوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے - جنگلوں میں برف سے رستے رک گئے - سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے - میدان ، کھیت ، گلی ، کوچہ میں گھر گھر قد آدم برفیں چڑھ گئیں - بازاروں میں سناٹا ، کارخانے بند ، غریب کاریگروں کے کاروبار ان کے ہاتھ سے بھی سوا ٹھنڈے - کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں - جلدی گراؤ ! نہیں تو گھر بیٹھا - امراء کے غلام ، نوکر ، مزدور ، لکڑی کے پنج شاخے اور پھاوڑیاں لیے ہیں - برف گرا رہے ہیں - غریب غربا اپنا

کام آپ ہی کرتے ہیں - پھر گھروں میں آ گھستے ہیں - آگ بغیر
گزارہ نہیں - انگیٹھی بیچ میں لیے بیٹھے ہیں - جن کو خدا نے دیا
ہے اُن کے آتشدان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں - کمروں کے دروازے
بند ہوتے ہیں - وہ گھروں میں دنبے کاٹتے ہیں - مرغ ذبح کرتے ہیں
نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دم دیتے ہیں - اس کی یخنیاں پیتے ہیں -
کلے پائے اور شب دیگیں پکا پکا کر کھاتے ہیں اور چائیں اڑاتے
ہیں - لیکن باہر تمام عالم ویرانہ ہے - کھیت اور باغ سب سنسان -
گیدڑ - لومڑی ، خرگوش بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا
اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس رہتے ہیں -

بھیڑیوں کو اس موسم میں سخت مشکل ہوتی ہے - وہ گوشت
کے سوا اور کچھ کھاتے نہیں اور کسی قسم کا ذخیرہ رکھتے
نہیں - باہر برف کی کثرت سے کتا تک نہیں نظر آتا - گلے سب
بند ہو جاتے ہیں - یہ دس دس بیس بیس جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں -
مگر ہر بھیڑیا اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی آنکھ سب پر پڑے -
ہر چند بھوک ، پیاس ، تھکن سے چوُر ہوتے ہیں مگر ایک کو
دوسرے پر اعتبار نہیں ، اس لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے
رہتے ہیں - آخر نیند تو ظالم ہے کسی کی ذرا آنکھ جھپکی اور جتنے
بیٹھے تھے جھٹ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں ، فوراً پھاڑ چیر تکا بوٹی کر کے
کھا ہی جاتے ہیں - اس سے اہل ملک نے اصطلاح نکالی "گرگ آشتی"
یعنی اس بد ذات جانور کے ملاپ کا بھی اعتبار نہیں -

ملک کے لوگ اسی برف کے کیڑے ہیں - انھیں یہ سردی
کچھ بہت دکھ نہیں دیتی - اس لیے بازار چلتے رہتے ہیں - حاجت مند
بچارے یا اکثر مصیبت کے مارے سفر بھی کرتے ہیں - ان کے
نمدی چغوں پر برف پڑی ہوئی - پلکوں پر برف جمی ہوئی - موچھیں
اور داڑھی میں گویا شیشے کی سلائیاں لٹکتی ہیں - اس عالم میں

پرند جانور بھی کم نکلتے ہیں ۔ البتہ خاص قسم کے کوے اور بعض جانور اڑتے پھرتے ہیں ۔ ان کی پیٹھ اور بازوؤں پر برف جمی ہوتی ہے...... اس حالت میں کبھی جھکڑ چلنے لگتا ہے اور جو برف پڑی ہوئی تھی وہ خاک کی طرح اڑتی ہے اور بدن اور چہرے پر چھرے کا کام کرتی ہے اور کوئی ذرہ آنکھ میں پڑ جاتا ہے تو بڑی تکلیف دیتا ہے ۔

ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک میں تھا ۔ برفیں پڑ رہی تھیں ۔ دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا ۔ دریائے سیحوں رستے میں ملا ۔ اس پار سے اس پار تک ایک ایک تختہ آئینے کا تھا ۔ شتری اور اسپی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے ۔ میں ایک بلند کنارے پر کھڑا دیکھتا تھا ۔ چونٹیوں سی قطار عجب بہار دیتی تھی ۔ رستے میں کئی منزلیں ایسی ملیں جہاں سرا یا مکان کچھ نہ تھا کہ جس میں ذرا سا سر چھپا بیٹھیں ۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور ادھر آدھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے ۔ ہم نے ایک پتھر کی آڑ میں برف ہٹا کر زمین نکالی ۔ ادھر آدھر سے دو چار لکڑ گھسیٹ لائے ۔ ان میں آگ سلگائی بستر کرکے پڑے اور گٹھڑی ہو کر سکڑ رہے ۔ غنیمت یہ ہے کہ رات کو ہوا بند ہوتی ہے ۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے بعد اٹھ کر چائے بناتے ۔ ایک ایک پیالی پی کر سینے گرم کرتے اور پھر پڑ رہتے تھے خدا خدا کرکے صبح ہوئی ۔

اشفاق احمد

ولادت : ۱۹۲۵ء

خوابوں کا جزیرہ

"یہ امریکہ نہیں ہے جو تم دیکھ رہے ہو۔"

"یا جو تم دیکھ چکے ہو"

"اصل امریکہ نیویارک ہے"

"اصل امریکہ کیلیفورنیا ہے"

"نیویارک سٹی"

سان فرانسیسکو

گلوریا اور میری آپس میں جھگڑ رہی تھیں اور بوئنگ طیارہ بڑے بڑے پر پھیلائے زوں زوں کی آواز نکالتا نیویارک شہر پر منڈلا رہا تھا۔ کیپٹن نے کہا "خواتین و حضرات میں ٹھیک سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم کس وقت لینڈ کریں گے۔ لیکن اتنا عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ لینڈنگ کیو میں اس وقت ہمارا ساتواں نمبر ہے"

ساتوں جہاز کافی دیر تک فضا میں تیرتے رہے پھر ایک ایک کر کے اترنے لگے۔ جس وقت ہمارے بوئنگ کے پاؤں زمین پر پڑے

تو اپنی ہستی کا پھر سے یقین ہونے لگا - موسیقی بج رہی تھی - اور جہاز ہولے ہولے ٹیکسی کرتا ہوا ہوائی اڈے کی عمارت کی طرف بڑھ رہا تھا - میں نے شیشوں میں سے دیکھا نیویارک کی فلک بوس عمارتیں ایک دوسری کے پیچھے آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں میرے کانوں میں پھر گلوریا اور میری کے فقرے گونجنے لگے اور مجھے بریڈ لاف کی وہ بھیگی ہوئی شام یاد آ گئی جب ہم بیٹی کے کمرے میں آتش دان میں لکڑیاں جلاتے ہوے ادب اور تھیٹر پر زور دار بحث کر رہے تھے اور فریج میں سے بند ٹھنڈے خربوزے نکال کر کھا رہے تھے - گلوریا نیویارک میں رہتی تھی اور اس شہر کو امریکہ کا نمائندہ متصور کرتی تھی - میری سان فرانسیسکو کی باسی تھی اور وہ اپنے شہر کو امریکی تہذیب کا اصل علمبردار سمجھتی تھی - جب دونوں میں کافی گرما گرمی ہو گئی تو بیٹی نے ایک بھونڈا سا صلح جو قسم کا گانا شروع کر دیا اور دونوں اپنی اپنی کرسیوں سے ٹیک لگا کر بھڑ بھڑ جلتی آگ کا نظارہ کرنے لگیں -

ائر پورٹ بلڈنگ کے بڑے ہال میں ہم کھڑے اپنے سامان کا انتظار کر رہے تھے - کہ میری نظر سرخ رنگ کے ایک نوٹس بورڈ پر پڑی لکھا تھا -

"جاپانی پسوؤں سے ہوشیار رہیے - یہ پسو آپ کے سامان اور کپڑوں سے چمٹ کر جہاز میں پہنچ جاتے ہیں - اور وہاں سے دوسرے مسافروں پر منتقل ہو کر دور دراز علاقوں میں پھیل جاتے ہیں - ہم انھیں تلف کرنے کی حتی‌الوسع کوشش کرتے ہیں لیکن آپ بھی ان سے ہوشیار رہیے اور اس معاملے میں ہماری مدد کیجیے -"

گلوریا بیگم تمھارے شہر میں پسوؤں کی کیا خبر ہے ؟

میرا بکس آگیا اور میں اسے کندھے پر اٹھا کر بس پکڑنے نیچے پورچ میں چلا آیا -

نیویارک کے بارے میں لڑکپن میں بڑے بڑے خواب دیکھے تھے اور یہ خواب اپنی اصل تعبیریں لے کر کوچ کے ساتھ ساتھ بھاگ رہے تھے میرا خیال تھا نیویارک کی سڑکیں شفاف اور یہاں کے گھر اجلے اجلے ہوں گے - سڑکوں پر بلا کی بھیڑ ہو گی - کوئی آدمی پیدل چلتا نظر نہیں آئے گا - ہر شخص نے بڑا طرح دار سوٹ پہن رکھا ہو گا - اور ہر میم نک سک سے درست فلم کی ہیروئن نظر آتی ہو گی - لیکن میرے خوابوں کی تعبیریں بھائیں بھائیں کرتی مجھے ڈرا رہی تھیں - اور کوچ سڑک کا سینہ کاٹتی بھاگتی جا رہی تھی کوچ میں سوائے میرے اور کوئی غیر ملکی نہیں تھا ، لیکن ہر ملکی میری طرح گردن گھما گھما کر باہر شہر کا نظارہ کر رہا تھا اور روشنیوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا - ایک بزنس مین گود میں سفری ٹیپ ریکارڈر رکھے ، چٹھیاں ریکارڈ کر رہا تھا - دوسرا اجنبی شیور سے اپنی داڑھی بنا رہا تھا - ایک عورت اپنے ہینڈ بیگ کے آئینے میں مسلسل اپنی شکل دیکھے جا رہی تھی اور میں اس کی صورت کا نظارہ کر رہا تھا -

ائر ٹرمینل پر جس ٹیکسی والے نے مجھ پر رحم کھایا اور پچھلا دروازہ کھول کر مجھے اندر بیٹھنے کی دعوت دی وہ چھے فٹ ڈیڑھ انچ کا ایک دبلا پتلا ادھیڑ عمر آدمی تھا - جس نے نہایت بوسیدہ برساتی پہن رکھی تھی اور جس کی ٹوپی کے کنارے میل سے چیکٹ ہو رہے تھے - جب ہم اس عمارت سے باہر نکلے تو اس نے اپنی نگاہیں گاڑ کر پوچھا -

ہم کہاں جا رہے ہیں ؟

میں نے کوٹ کی جیب سے میزبان حکومت کا وہ لمبا سا لفافہ

نکالا جس میں میرے نیویارک ہوٹل کا نام اور پتا درج تھا میں نے کھنکار کر اور گلا اچھی طرح سے صاف کرکے نام اور پتا تین مرتبہ بہ آواز بلند پڑھا - لیکن ٹیکسی ڈرائیور کا کوئی رد عمل معلوم نہ ہوا - اس نے موٹر چلاتے ہوے ایک ہاتھ سٹئرنگ سے اٹھایا اور پیچھے میری طرف بڑھا کر وہ کاغذ مجھ سے لے لیا - اس کا بازو بہت لمبا تھا ہاتھ بہت کرخت اور انگلیاں نوکیلی تھیں - ہوٹل کا نام پتا پڑھنے کے بعد اس نے وہ کاغذ مجھے واپس کر دیا اور آرام سے موٹر چلانے لگا باہر ٹھنڈی برفیلی اور تیز ہوا چل رہی تھی اور ٹیکسی کے کھلے شیشے میں سے کٹاریں مار رہی تھی - میں نے میٹر کی طرف غور سے دیکھا جو کھٹا کھٹ سینٹوں پر سینٹ بدلے جاتا تھا اور دوسری کھڑکی میں ڈالر اوپر ابھار رہا تھا جب میٹر کی کھڑکی میں تیسرا ڈالر انگڑائی لے کر چیتے کی طرح لپکا تو میرا دل دھک سے رہ گیا ڈرائیور نے ہاتھ کا اشارہ دے کر بریکیں باندھیں - اور ٹیکسی ہوٹل کے دروازے پر آن رکی - ٹیکسی کے رکتے دس سینٹ اور میٹر کی آنکھ میں آ کر چمکنے لگے - میں نے جلدی سے اپنا سامان نکال کر پٹڑی پر رکھا اور چار ڈالر کرخت ہاتھ میں تھما کر کہا شکریہ - باقی کی ریزگاری رہنے دیجیے -

دس فیصد ٹپ کے حساب سے کل تیس سینٹ بنتے تھے - لیکن ساٹھ سینٹ اور میں نے خوفزدگی کے تحت ادا کر دیے مبادا کہیں وہ ڈرٹی صلواتیں وغیرہ کی گردان شروع کر دے -

ہوٹل کا کاؤنٹر کلرک بہت شریف آدمی تھا - اس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا اور کھلی باچھوں کے ساتھ خوش آمدید کہا - میں نے اُسے اپنا نام بتاتے ہوے کہا :

"میری بکنگ یہاں ہے سٹیٹ ڈپارٹمنٹ کی معرفت"

ضرور ضرور اس نے رجسٹر کے اوراق الٹتے ہوے کہا یہ رہی

آپ کی بکنگ پھر اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پوچھا آپ پاکستان سے آئے ہیں۔؟

"جی"

واہ وا کیا کہنے پاکستان کے بہت بڑا ملک ہے۔ پاکستان، ہمارا دوست ہے۔ ہمارے ہوٹل نے بڑی سروس کی ہے آپ کے ہم وطنوں کی"

"میرے ہم وطنوں کی؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا"

جی ہاں اپ سڈکین کو جانتے ہیں؟ اپ کے ملک کا نامی گرامی مصور ہے۔

"صادقین؟ میں نے پوچھا

بالکل" اس نے مسکرا کر کہا۔ سادکین ہمارے ہوٹل میں کوئی دو مہینے رہا ہے پانچویں منزل پر بہت نفیس آدمی تھا بالکل آپ کی طرح، اس کے بال بہت لمبے تھے۔ کلرک نے مجھے ہنسانے کی کوشش کرتے ہوے کہا۔

یہ سن کر مجھے اس ہوٹل سے اپنے پن کی باس آنے لگی۔ کیا ہی اچھا ہوتا۔ میں نے اپنے دل میں کہا اگر صادقین ان دنوں یہاں ہوتا۔ پھر مجھے اس بڑے شہر میں گھومنے پھرنے کی آسانی ہو جاتی۔ لیکن وہ لندن جا چکا تھا۔ اور اب سوائے راشد صاحب کے یہاں کوئی اور سہارا نہ تھا۔ میں نے اپنا بکس اٹھایا، چابی لی اور نیگرو ملازم کے ساتھ لفٹ میں سوار ہو گیا۔ پانچویں منزل پر لفٹ رکی۔ نیگرو ملازم نے میرا بکس لفٹ سے نکالا اور ایک لمبی سی گیلری سے گزار کر مجھے کمرہ نمبر ۵۱۳ پر لا کھڑا کیا۔ پھر اس نے چابی ڈال کر دروازہ کھولا میرا بکس اندر تپائی پر رکھا اور کہا: وہ سامنے غسل خانہ ہے۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔

پچاس سینٹ کا ایک سکہ جیب کے ایک کونے میں پڑا تھا ۔ میں نے حوصلہ کر کے اسے باہر نکالا اور بسم اللہ کہہ کر نیگرو ملازم کے حوالے کر دیا ۔ اس نے سکے کو دو تین مرتبہ الٹ پلٹ کر دیکھا پھر اپنی ٹوپی اتاری اور دوبارہ سکے کو غور سے دیکھنے لگا ۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ۔ گال کو دو تین مرتبہ یوں ہلایا جیسے گھوڑا ہنہنانے سے اپنے نتھنے پھڑکاتا ہے ۔ اور پھر اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا ۔ پھر کھٹ سے پٹ بھڑا ۔ قدموں کی چاپ سنائی دی ۔ اور میں نے آنکھیں کھول دیں نیگرو ملازم جا چکا تھا ۔

یہ آٹھ ڈالر روز کا ایک سستا سا کمرہ تھا ۔ خاصا کشادہ اور ہوادار ایک کھڑکی کمرے میں تھی ۔ دوسری غسل خانے میں ۔ دیواروں پر بسکٹی رنگ کا روغن پھرا تھا اور کھڑکیوں کے سامنے گہرے رنگ کے دبیز پردے لٹک رہے تھے ۔ پلنگ کے سرہانے چھوٹی سی تپائی پر پرانی وضع کا ٹیلیفون رکھا تھا اور کونے میں ایک فریج پڑا تھا ۔ لکھنے کی میز پر قلمدان میں نیلے اور سرخ رنگ کے دو قلم ایستادہ تھے ۔ ان دواتوں میں روشنائی نہ تھی ۔ درازوں میں ہوٹل کے چھپے ہوئے کاغذ اور لفافے تھے اور ان کے نیچے سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیج بکھرے ہوئے تھے ۔ میں نے دانت صاف کیے ، منہ دھویا ، بوٹ اتارے اور پلنگ پر آلتی پالتی مار کے تھیلا کھولا جس میں پنیر اور سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی تھی ۔ نان جویں اور سوکھے پنیر کی نعمتوں کو زہر مار کرنے کے بعد ٹونٹی کا ٹھنڈا پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کر کے کافی پینے چلا گیا ۔

انیسویں گلی روشنیوں سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی ۔ گاڑیاں ایک دوسری کے پیچھے چیختی چنگھاڑتی جا رہی تھیں ۔ اور پٹڑی پر جوتے پالش کرنے والے اپنے اڈے جمائے بیٹھے تھے ۔ شام کے اخبار دھڑا

دھڑ بک رہے تھے - اور قہوہ خانوں اور ریسٹورانوں کے اندر کھانا کھانے والے اشیاے خوردنی کے ٹرے اٹھائے خالی میز کی تلاش میں چکر لگا رہے تھے - ہوٹل کے پہلو میں ایک آٹومیٹک میں داخل ہوکر میں نے سیاہ کافی کی ایک پیالی لی اور اس میں آٹھ چمچ چینی کے ڈال کے وہ شیرہ پی گیا - اس سے تھکن بھی کم ہوئی اور رات کے کھانے کا بھرم بھی رہ گیا -

آدھی رات کے وقت میرے خوابوں کے جزیرے میں گڑگڑاہٹ سی ہوئی اور میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھا - مجھے یوں لگا جیسے مین ہٹن میں زلزلہ آ گیا ہو اور فلک بوس عمارتوں نے بے بس ہو کر ایک دوسری سے سر ٹکرایا ہو - میں خوف سے کانپنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میرا پلنگ لرزنے لگا - آنکھیں کھول کر ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اور جب تک آنکھیں نہیں کھلتی تھیں اس وقت تک پلنگ کا رعشہ کم ہونے کی امید نہیں تھی - اچانک پھر دھڑ بھڑ پھٹاک اور گھرر گھرر کی آواز آئی اور آتی چلی گئی کمرے کے کونے میں رکھا ہوا پرانا فریج چل رہا تھا اور اس کی آواز سے سارا کمرہ گونج رہا تھا میں نے بستر سے نکل کر فریج بند کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا سوئچ کہیں نظر نہ آیا - تار نیچے پلگ میں لگی تھی - اور اس کا کوئی بٹن نہ تھا - فریج اس قدر بھاری تھا کہ میں اکیلا اس کو ہلا بھی نہ سکتا تھا اور اندر اس کا ریگولیٹر خراب تھا - میں نے اس کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا - چھوٹے سے بلب کی پیلی پیلی روشنی سارے کمرے میں پھیل گئی - فریج خالی تھا اور اس کے خانوں میں کوزہ مصری کی سی برف جمی ہوئی تھی - اس کوزہ مصری میں کسی بوتل کے دو ڈھکنے پھنسے ہوئے تھے اور ان کے نیچے کین اوپنر کی چھوٹی سی قبر تھی - کین اوپنر کا ایک بازو ایک سنگ مرمر کے تعویذ سے باہر تھا اور ہچکاک کی قلم کا ایک حصّہ نظر آتا تھا - میں فریج کے

دروازے کو یوں ہی کھلا چھوڑ کر پھر اپنے بستر پر آ لیٹا اور ایک سو اسی گننے تک سو گیا ۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد مجھے یوں لگا ۔ جیسے میرے پلنگ کی پائنتی کوئی چیز بھاگتی پھرتی ہو ۔ ننھی سی سیماب پا خوفناک سی چیز میں نے آنکھ کھول کر فریج کی طرف دیکھا اس کی بہت سی برف پگھل چکی تھی ۔ شاید سنگ مرمر کی تربت سے آزاد ہو کر کین اوپنر بھیک مانگ رہا تھا آخر ایسے محیرالعقول واقعات رونما ہوتے ہی رہتے ہیں ۔ لیکن وہ کین اوپنر نہ تھا ایک جمبو سائز چوہا تھا جو قالین پر پڑے ہوئے میرے چمڑے کے تھیلے کو کھدیڑ رہا تھا جس میں نان جویں اور سوکھے پنیر کا لفافہ بند تھا ۔ چوہے نے ایک نظر میری طرف کھلی آنکھوں سے دیکھا اور پھر زقند لگا کر لکھنے والی میز کے نیچے بھاگ گیا ۔ اس وقت مجھے سمجھ آئی کہ ہوٹل کے چھپے ہوئے پیڈ اور لفافوں کے نیچے کالے کالے بیج سے کیا تھے ۔

اگلے دن صبح سویرے پانچویں اے وینیو پر چلتے ہوئے میرے قدم ہر پٹڑی پر یوں پڑ رہے تھے ۔ جیسے میں کہکشاں پر چلا جا رہا ہوں اور میرے ہم وطن اپنے ملک کے دونوں حصوں میں نیچے کھڑے مجھے حسرت اور چاہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہوں ۔ اپنی برتری کا احساس مجھے اوپر ہی اوپر لیے جا رہا تھا اور ان لوگوں پر مسلسل ترس آ رہا تھا جنھوں نے امریکہ نہیں دیکھا اور ان لوگوں سے میری ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی ، جنھوں نے فلموں میں ہالی وڈ، شکاگو اور نیویارک کو دیکھا تھا ۔ اور ان کی کراچی تک پہنچنے کی بھی استطاعت نہیں تھی ۔ اپنی جملہ صلاحیتوں پر ناز کرتا اور اپنی خوبیوں کو سراہتا ، میں ناک کی سیدھ یو ۔ این ۔ او بلڈنگ کی طرف چلا جا رہا تھا ۔

یو - این - او کی عمارت دیکھ کر خوشی سے میری چیخ نکل گئی - اس وقت مجھے اپنی برتری اور عظمت کا اور بھی احساس ہوا کہاں ہیں وہ لوگ جو صرف ٹکٹوں کیلنڈروں اور ہوائی کمپنیوں کے اشتہارات ہی پر اس عمارت کو دیکھ سکتے ہیں میں نے انکوائری سے ن - م - راشد صاحب کا پتا پوچھا اور لفٹ پکڑ کر اکیسویں منزل کی طرف روانہ ہو گیا -

راشد صاحب اپنے کمرے میں کاغذات پر جھکے بیٹھے تھے - ان کی فیلٹ کونے کے میز پر پڑی تھی اور ان کی سیاہ برساتی کھونٹی سے لٹک رہی تھی - مجھے دیکھ کر اٹھے اور فارسی کا ایک شعر پڑھا میں نے مسکرا کر شعر ٹال دینا چاہا -

"فارسی سمجھتے ہو ؟"

میں نے کہا جی کم کم- فرمانے لگے پھر تمھاری آدھی عمر ضائع ہو گئی ہے - مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ابھی میری آدھی عمر باقی ہے -

"پھر انھوں نے پوچھا کہو نیویارک پسند آیا ؟ -"

میں نے کہا جی بہت - کہنے لگے کچھ کھلیں آنکھیں ؟

"میں نے کہا - جی بہت"

"اب احساس ہوا ہے کہ تم کہاں رہتے ہو"؟

"جی بہت"

اور سناؤ لاہور کا کیا حال تھا ؟

بہت اچھا جی - اسمبلی کے پہلو میں آٹھ منزلہ عمارت بن رہی ہے آٹھ منزلہ ! انھوں ے قہقہہ لگایا بہت ترقی کر رہا ہے ہمارا شہر" راشد صاحب کے کمرے کی کھڑکیاں باہر کھاڑی کے نیلے پانیوں پر کھلتی تھیں باوجودیکہ دریچے اچھی طرح بند تھے ، پھر بھی

نسیم سحری کی خوشبو اندر کمرے میں پھیلی ہوئی تھی - میں شیشوں سے باہر مٹیالی عمارتوں اور کالا سیاہ دھواں چھوڑتے دخانی جہازوں کو دیکھ رہا تھا کہ راشد صاحب نے کہا وہ دیکھو ادھر وہ سامنے"

ایک موٹر لانچ بجلی کی سی تیزی سے نیلے پانیوں پر پھیلی جا رہی تھی - کہنے لگے یہ نئی ایجاد ہے کشتی پانی پر نہیں پانی کی سطح سے دو فٹ اونچا چلتی ہے میں سکتے میں آ گیا موٹر بوٹ پانی کی سطح سے دو فٹ اوپر بھاگی جا رہی تھی - راشد صاحب نے کہا :

"اب آیا ہوش سمجھے کہاں ہو ؟"

میں نے کہا"جی ہاں"

پھر ہم ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے اور جب ان کی ملکی ڈاک کا نیا پلندہ آ گیا تو میں اگلے دن پھر آنے کا وعدہ کر کے نیچے اتر آیا - باہر بڑی مزے دار دھوپ پھیلی تھی اور یو - این - او کی عمارت کے سامنے سڑک کے پار لکڑی کے بنچوں پر اکا دکا لوگ فارغ بیٹھے تھے - میں بھی سستانے کی غرض سے ایک بنچ پر جا بیٹھا - دوسرے کونے پر ایک بوڑھا نیگرو ، آنکھوں پر فیلٹ گرائے دونوں ہاتھوں کی کنگھی گود میں ڈالے ، نیم دراز تھا - میں نے تھیلے میں سے اپنی بیوی کا خط نکالا اور بچوں کی رنگین تصویریں دیکھنے لگا - جو انھوں نے میری غیر موجودگی میں شالامار جا کر خاص میرے لیے اتروائی تھیں - شالامار وسیع و عریض قطعہ ہائے سبز پر میرے بھائی اور بچے لڈی ناچ ناچ رہے تھے - "شکر بھجی" کھیل رہے تھے - درختوں پر چڑھے ہوئے تھے ایک دوسرے کو پھولوں کی چھڑیاں مار رہے تھے - بنچ کے دوسرے کونے پر بیٹھے ہوئے ، سال خوردہ نیگرو کو کھانسی کا دورہ پڑا اور اس نے پٹاخ

سے اپنے سامنے تھوک دیا ۔ بلغم بھرے تھوک میں چونّی بھر سیاہی مائل خون کا دھبہ تھا ۔ میں نے ڈر کر گھبرا کر اور گھن کھا کر تصویروں کا لفافہ بند کر دیا ۔ اور تھیلے میں ڈال کر سامنے آ کر رکنے والی بس میں سوار ہو گیا ۔

بس کے اندر بڑے خوبصورت تجارتی اداروں کے بڑے خوبصورت اشتہار لگے تھے ۔ بیچ بیچ میں محکمۂ تعلقات عامہ کے پلے کارڈ بھی تھے ۔

"اچھی صحت مند اور ستھری غذا کھائیے ۔"

"اپنے آپ کو تپ دق سے محفوظ رکھیے یہ موذی مرض ہر سال ہزاروں امریکیوں کی جان لے لیتا ہے ۔"

"تپ دق کے خلاف جہاد کیجیے ، خود ٹیکہ لگوائیے ، دوسروں کو اس کی ترغیب دیجیے"

ایک خوبصورت سا لڑکا جزدان کندھے پر ڈالے سکول جا رہا تھا ۔ نیچے لکھا تھا "اسے دودھ اور تازہ پھلوں کی ضرورت ہے ۔ اس کی ضرورت کا خیال رکھیے ۔ امریکہ کو صحت مند بنائیے ۔"

جب یہ بس مجھے میری منزل انیسویں گلی کے ہوٹل پر لے جانے کے بجائے کہیں اور ہی لے جاتی نظر آئی ۔ تو میں اگلے سٹاپ پر اتر گیا ۔ اس بھرے پرے شہر میں نیا ہونے کی وجہ سے میں کچھ گھبرایا ہوا سا تھا ۔ اور راستہ بھولنے کی وجہ سے میری کیفیت کچھ اور بھی احمقوں کی سی ہو رہی تھی اچانک دور سے ایک مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا ۔

اس نے ٹوپی اٹھا کر مجھے سلام کیا اور بڑی خندہ پیشانی سے میری طرف میرے قریب پہنچ کر اس نے میرے کان کی طرف جھکتے ہوئے کہا ۔

ایک ڈائم جناب عالی ۔

میں نے کہا کیا مطلب"

میں نے کہا تم کوئی کام کیوں نہیں کرتے ؟

کام ! وہ زور سے ہنسا اور پھر سرگوشی کے لہجے میں بولا : "کام کرنا مجھے پسند نہیں - فضول واہیات-لائیے ایک عدد ڈائم عنایت فرمائیے -"

اس کے بعد میں نے اور کچھ پوچھنے کی جرأت ہی نہ کی - مجھے یقین ہے کہ اگر میں اس سے کچھ اور پوچھتا تو وہ ایک خارا شگاف چاقو میرے پیٹ میں اتار کر کہتا بکواس ہی کیے جاؤ گے یا کچھ دو گے بھی -

نیویارک کا فقیر پاکستانی فقیر سے ایک ڈائم لے کر چلا گیا -

رات کے گیارہ بجے میں نے اپنا تھیلا کھولا اس میں سے نیلے رنگ کا پیڈ نکالا اور اپنے ہوٹل کی لکھنے والی میز پر ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس رکھ کے ریاض کو خط لکھنے لگا -

"نیویارک کی ایک اپنی فضا ، ایک اپنی بو باس ہے جو دنیا کے کسی اور شہر میں نہیں ملتی - اس وقت میں ہلٹن کی بار میں کٹ گلاس کا جام تھامے تمہیں یاد کر رہا ہوں - یہ کاک ٹیل پارٹی میرے اعزاز میں ٹائم اینڈ گفٹ کے ایک ڈائرکٹر نے دی ہے -"

"ہال کی مدھم روشنیوں میں دھوئیں کے مرغولے بل کھا رہے ہیں - نیویارک کے باہر کی بوباس یہاں اندر بھی ہے - سامنے پیلی پیلی روشنی کے گول گول ہالوں میں ساٹھ پیس کا آرکسٹرا بج رہا ہے - جب کبھی دروازے پر اطلسی پردہ کھلتا ہے تو باہر کے بلند و بالا کاخ و کُو نظر آ جاتے ہیں - نیویارک اونچی عمارتوں اور اونچی امارتوں کا شہر ہے یوں لگتا ہے کہ اس خوابوں کے جزیرے میں ہر شخص کے ہاتھ میں اللہ دین کا چراغ ہے - جو چاہتا ہے

مانگتا ہے مل جاتا ہے" میں ابھی یہ خط یہیں تک لکھ پایا تھا کہ
کل رات والا چوہا میز کے نیچے سے بے باکانہ نکل کر میرے پلنگ
کے پاس گھومنے لگا میں نے جو گردن گھما کر اسے دیکھا تو وہ
ہڑ بڑا کر بھاگا اور ایک ہی جست میں پھر میز کے نیچے جا چھپا
میں نے اپنا تھیلا اچھی طرح بند کرکے اسے کھونٹی پر لٹکا دیا۔"

مجھے معلوم ہے وہ نان جویں اور سوکھے پنیر کی تلاش میں
آیا تھا۔

احمد شاہ بخاری (پطرس)

(۱۸۹۸ء تا ۱۹۵۸ء)

لاہور کا جغرافیہ

تمہید : تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرے کو دائیں سے بائیں گھمائیے، حتٰی کہ ہندوستان کا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے، پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے، جہاں یہ نام کرے پر مرقوم ہو، وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع : ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے، لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سر زمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اسی

کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں - ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پُل بنے ہوے ہیں ، ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے ، بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر -

حدود اربعہ : کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے ، اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے ——ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک صوبے کا نام ہو گا جس کا دارالخلافہ پنجاب ہوگا - یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے - لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے ، گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے -

آب و ہوا : لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو تقریباً سب کی سب غلط ہیں - حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے - میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جب کہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں - اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے -

لیکن بدقسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی ، اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بیجا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے

گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے، کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں، جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں، اُمید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک سکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے، یہ سکیم نظام سقے کے وقت سے چلی آتی ہے، لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سقے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے بعض اہم مسودات تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں اُن کے پڑھنے میں بہت دِقّت پیش آ رہی ہے، اس لیے ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق میں ابھی چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہو گا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہو گی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سقے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے نل ضروری ہیں، چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جابجا نل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض نلوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ ٹپکتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منا رہے ہیں۔

ذرائع آمدورفت : جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہییں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہٗ اثر پذیر ہو سکیں - جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے ، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے ، یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی - یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے ، اور بیحد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے - چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردو بدل گوارا نہیں کیا جاتا - وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنھوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے ، آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں -

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پہیے لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں - اصطلاح میں اس کو تانگا کہتے ہیں - شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں ، تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جا سکے -

اصلی اور خالص گھوڑے لاہور میں خوراک کے کام آتے ہیں ، قصابوں کی دوکانوں پر انھیں کا گوشت بکتا ہے ، تانگوں میں ان کے بجائے بناسپتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں ، بناسپتی گھوڑا شکل و صورت میں دم دار ستارے سے ملتا ہے ، کیونکہ اس گھوڑے کی ساخت میں دم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے - حرکت کے وقت اپنی دم دبا لیتا ہے - اور ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولہ اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے ، اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے -

قابل دید مقامات : لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں ، اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے - شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکا دیے جاتے ہیں ، مثلاً "اہل لاہور کو مژدہ" یا "اچھا مستا مال" اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہلِ علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً گریجویٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹس کے لیے نادر موقع" یا "کہتی ہے ہم کو خلقِ خُدا غائبانہ کیا" رفتہ رفتہ گھر کی چہار دیواری مکمل ڈائرکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے ، دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتا درج ہے ، بائیں طرف حافظے کی گولیوں کا بیان ہے ، اس کھڑکی کے اوپر "انجمن خدام ملت" کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے - اس کھڑکی پر مشہور لیڈر کے خانگی حالات بالوضاحت بیان کر دیے گئے ہیں - عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے اور اصطبل کے دروازے پر مس نغمہ جان کی تصویر اور ان کے فلم کے محاسن گنوا رکھے ہیں - یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد ، یا انقلاب عظیم کی ابتداء چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لیپ دی جاتی ہے ، اسی لیے عمارتوں کی ظاہری صورت ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے اور ان کو پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے -

صنعت و حرفت : اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی ہے اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے - ہر رسالے کا نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر

صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں ۔ عام نمبر میں صرف ایڈیٹر کی تصویر اور خاص نمبروں میں مس سلوچنا اور مس کجن کی تصاویر بھی دی جاتی ہیں ، اس سے ادب کو بہت فروغ حاصل ہوتا ہے ۔ اور فن تنقید ترقی کرتا ہے ۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے ، پریزیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں اس لیے فی الحال دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں ، چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف نہیں اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے ۔ سہ پہر کو کسی سنیما کی انجمن میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے ۔ اس سے ان کا مطمح نظر وسیع رہتا ہے ۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو تینوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے ۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے ۔

پیداوار : لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دساور کو بھیجے جاتے ہیں ۔ فصل شروع سرما میں بوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے ۔

طلبہ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں ۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے ۔ یہ طلبہ عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں ، بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں ، اور اس عمل کے بعد کسی ریستوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے ۔

دوسری قسم جلالی طلبہ کی ہے ۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے ، اس لیے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے ۔ شام کے وقت چند مصاحبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں

اور جود و سخا کے خم لنڈھاتے پھرتے ہیں ۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی ، اس لیے ہوسٹل میں فروکش نہیں ہوتے ۔

تیسری قسم خیالی طلبہ کی ہے ۔ یہ اکثر روپ ، اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باآواز بلند تبادلہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں ۔ صحت جسمانی کو ارتقاے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں اس لیے علی الصباح پانچ چھے ڈنڑ پیلتے ہیں اور شام کو ہوسٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں ۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں ۔

چوتھی قسم خالی طلبہ کی ہے ۔ یہ طلبہ کی خالص ترین قسم ہے ۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلائش سے تر ہونے نہیں پاتا ۔ کتابیں ، امتحانات مطالعہ اور اسی قسم کے خرخشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے جس معصومیت کو لے کر وہ کالج میں پہنچے تھے ۔ اُسے آخر تک ملوث نہیں ہونے دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اسی طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانتوں میں زبان رہتی ہے ۔

پچھلے چند سالوں سے طلبہ کی ایک اور قسم بھی دکھائی دینے لگی ہے ان کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے محدب شیشے کا استعمال ضروری ہے ، یہ وہ لوگ ہیں جنھیں ریل کا ٹکٹ نصف قیمت پر ملتا ہے ، اور اگر چاہیں تو اپنی انا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں ۔

ابنِ انشاء

(۱۹۲۷ء تا ۱۹۷۸ء)

اشتہارات "ضرورت نہیں ہے" کے

ایک بزرگ اپنے نوکر کو فہمائش کر رہے تھے کہ تم پاگل گھامڑ ہو۔ دیکھو میر صاحب کا نوکر ہے اتنا دور اندیش کہ میر صاحب نے بازار سے بجلی کا بلب منگایا تو اس کے ساتھ ہی ایک بوتل مٹی کے تیل کی اور دو موم بتیاں بھی لے آیا کہ بلب فیوز ہو جائے تو لالٹین سے کام چل سکتا ہے۔ اس کی چمنی ٹوٹ جائے یا بتی ختم ہو جائے تو موم بتی روشن کی جا سکتی ہے۔ تم کو ٹیکسی لینے بھیجا تھا تم آدھے گھنٹے بعد ہاتھ لٹکاتے آ گئے۔ اگر ٹیکسی نہ ملتی تھی تو موٹر رکشا لے آتے۔ میر صاحب کا نوکر ہوتا تو موٹر رکشا لے کے آیا ہوتا تاکہ دوبارہ جانے کی ضرورت نہ پڑتی۔

نوکر بہت شرمندہ ہوا اور آقا کی بات پلے باندھ لی۔ چند دن بعد اتفاق سے آقا پر بخار کا حملہ ہوا تو انھوں نے اسے حکیم صاحب کو لانے کے لیے بھیجا۔ تھوڑی دیر میں حکیم صاحب تشریف لائے۔ تو ان کے پیچھے پیچھے تین آدمی اور تھے جو سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ ایک کی بغل میں کپڑے کا تھان تھا۔

دوسرے کے ہاتھ میں لوٹا اور تیسرے کے کاندھے پر پھاوڑا - آقا نے نوکر سے کہا - یہ کون لوگ ہیں میاں ؟ نوکر نے تعارف کرایا کہ جناب ویسے تو حکیم صاحب بہت حاذق ہیں لیکن اللہ کے کاموں میں کون دخل دے سکتا ہے - خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے تو میں درزی کو لے آیا ہوں اور وہ کفن کا کپڑا ساتھ لایا ہے - یہ دوسرے صاحب غسال ہیں اور تیسرے گورکن - ایک ساتھ اس لیے لے آیا کہ بار بار بھاگنا نہ پڑے -

ایسے ہی ایک بزرگ ہمارے حلقہ احباب میں بھی ہیں - گلی سے ریڑھی والا ہانک لگاتا گزر رہا تھا کہ انگور ہیں چمن کے - پیتے ہیں پیڑ کے پکے ہوئے - انھوں نے لڑکا بھیج کر اسے بلایا اور کہا - میاں جی معاف کیجیے ! ہمیں ضرورت نہیں ہے - پھل والا چلا گیا تو ہم نے عرض کیا کہ اس زحمت کی کیا ضرورت تھی - وہ تو جا ہی رہا تھا اسے روکنا کیا ضرور تھا - بولے : احتیاط کا تقاضا تھا کہ اس پر بات واضح کر دی جائے اور معذرت بھی کی جائے کیونکہ بے چارہ اتنی دور سے اتنی اُمید لے کر پھل بیچنے آتا ہے - دوسرے یہ کہ اسے یہ گمان نہ گزرے کہ اس گھر میں شاید بہرے رہتے ہیں جو اس کی آواز نہیں سن پاتے - یہی ہمارے دوست ایک روز کار میں ہمارے ساتھ گولی مار سے گزر رہے تھے ایک جگہ لکھا ہے تشریف لائیے - ربڑی قلفی اور لسی تیار ہے - انھوں نے فوراً کار ٹھہرائی اور دکاندار سے کہا کہ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے پاس فرصت نہیں - ہم ضروری کام سے جا رہے ہیں - دوسرے قلفی اور ربڑی ہم نہیں کھاتے اور لسّی کا بھلا یہ کون سا موسم ہے تو بہرحال تمھاری پیش کش کا شکریہ - وہ تو بیٹھا سنا کیا اور نہ جانے کیا سمجھا کہ کار میں واپس بیٹھتے ہوئے ہمارے دوست نے وضاحت کی کہ یہاں کے لوگ ان آداب کو کیا جانیں - یہاں تو دعوت نامہ آتا ہے اور اس کے نیچے R.S.V.P. لکھا ہوتا ہے کہ جواب سے مطلع فرمائیے جن کو شریک

نہیں ہونا ہوتا وہ بھی چپ بیٹھ رہتے ہیں ۔ میزبان کو مطلع کرنا ضروری نہیں سمجھتے کہ بندہ حاضر ہونے سے معذور ہے ، اس بچارے کا کھانا ضائع جاتا ہے ۔

ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود انہی آداب سے بے بہرہ لوگوں میں سے ہیں ۔ لوگ اخباروں میں طرح طرح کے اشتہارات چھپواتے ہیں کہ ہم پڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوں لیکن ہم انہیں پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں ۔ کوئی ہمارے لیے ٹھیکے کا بندوبست کرتا ہے اور ٹینڈر نوٹس شائع کرتا ہے ۔ کبھی کوئی ہمارے ہاتھ پلاٹ یا مکان بیچتا ہے ۔ کوئی ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنے نالائق فرزند کو جائیداد سے عاق کر دیا ہے ، کہیں کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم ان کی فرزندی قبول کر لیں اور ذات پات ، تعلیم اور تنخواہ کی شرطیں من و عن وہی رکھی جاتی ہیں ، جو ہم میں ہیں ۔ کوئی ہمیں گھر بیٹھے لاکھوں روپے کمانے کا لالچ دیتا ہے کوئی شارٹ ہینڈ سکھانے کی کوشش کرتا ہے ۔ بہت سے کالج مشتاق ہیں کہ ہم ان کے ہاں داخلے لیں اور بعضے اپنی کاریں اور ریفریجریٹر معقول قیمت پر ہماری نذر کرنے کی فکر میں رہتے ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب ضرورت مندوں سے آدمی کیسے عہدہ برآ ہو ۔ بہت سوچنے کے بعد یہ ترکیب ہماری سمجھ میں آئی ہے کہ جہاں ہم ضرورت ہے کا اشتہار چھپواتے ہیں ہماری دانست میں ان اشتہارات کی صورت کچھ اس قسم کی ہونی چاہیے :

کرائے کے لیے خالی نہیں ہے

۔۔۳ گز پر تین بیڈ روم کا ایک ہوا دار بنگلہ نما مکان ، جس میں نلکا ہے اور عین دروازے کے آگے کارپوریشن کا کوڑا ڈالنے کا ڈرم بھی ۔ کرائے پر دینا مقصود نہیں ہے ۔ نہ اس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ہے اور نہ چھے ماہ پیشگی کرایہ کی شرط ہے جن صاحبوں کو کرایے کے مکان کی ضرورت ہو وہ فون نمبر ۳۴۵۶۷ پر رجوع

نہ کریں کیوں کہ اس کا کچھ فائدہ نہیں ۔

اطلاع عام

راقم محمد دین ولد فتح دین کریانہ مرچنٹ یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہے کہ اس کا فرزند رحمت اللہ نہ نافرمان ہے نہ اوباشوں کی صحبت میں رہتا ہے لٰھذا اسے جائداد سے عاق کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ آئندہ جو صاحب اسے کوئی ادھار وغیرہ دیں گے ۔ وہ میری ذمہ داری پر دیں گے

ضرورت نہیں ہے

کار مارس مائنر ماڈل ۱۹۵۹ء بہترین کنڈیشن میں ۔ ایک بے آواز ریڈیو نہایت خوبصورت کیبینٹ ، ایک ویسپا موٹر سائیکل اور دیگر گھریلو سامان پنکھے پلنگ وغیرہ قسطوں پر یا بغیر قسطوں کے ہمیں درکار نہیں ۔ ہمارے ہاں خدا کے فضل سے یہ سب چیزیں پہلے سے موجود ہیں ۔ اوقات ملاقات ۳ تا ۸ بجے شام

عدم ضرورت رشتہ

ایک پنجابی نوجوان برسر روزگار آمدنی تقریباً پندرہ سو روپے ماہوار کے لیے کسی باسلیقہ خوبصورت شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ کے رشتے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ لڑکا پہلے سے شادی شدہ ہے ۔ خط و کتابت صیغہ راز میں نہیں رہے گی ۔ اس کے علاوہ بھی بے شمار لڑکے اور لڑکیوں کے لیے رشتے مطلوب نہیں ہیں ۔ پوسٹ بکس نمبر کراچی ۔

داخلے جاری نہ رکھیے

کراچی کے اکثر کالج آج کل انٹر اور ڈگری کلاسوں میں داخلے کے لیے اخباروں میں دھڑا دھڑ اشتہار دے رہے ہیں ۔ یہ سب اپنا وقت اور پیسہ ضائع کر رہے ہیں ۔ ہمیں ان کے ہاں داخل ہونا مقصود نہیں ۔ ہم نے کئی سال پہلے ایم ۔ اے پاس کر لیا تھا ۔

شفیق الرحمٰن

(ولادت : ۱۹۲۰ء)

کلید کامیابی

(حصہ دوم)

ہم لوگ خوش قسمت ہیں کیوں کہ ایک حیرت انگیز دور سے گذر رہے ہیں ۔ آج تک انسان کو ترقی کرنے کے اتنے موقعے کبھی میسر نہیں ہوے ۔ پرانے زمانے میں ہر ایک کو ہر ہنر خود سیکھنا پڑتا تھا لیکن آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد پر خواہ مخواہ تلا ہوا ہے اور بلاوجہ دوسروں کو شاہراہ کامیابی پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔

اس موضوع پر بے شمار کتابیں موجود ہیں ۔ اگر آپ کی مالی حالت مخدوش ہے تو فوراً "لاکھوں کماؤ" خرید لیجیے ۔ اگر مقدمہ بازی میں مشغول ہیں تو "رہنمائے قانون" لے آئیے ۔ اگر بیمار ہیں تو "گھر کا طبیب" پڑھنے سے شفا یقینی ہے ۔ اس طرح "کامیاب زندگی"، "کامیاب مرغی خانہ"، "ریڈیو کی کتاب"، "کلید کامیابی"، "کلید مویشیاں" اور دوسری لاتعداد کتابیں بنی نوع انسان کی جو خدمت کر رہی ہیں اُس سے ہم واقف ہیں ۔ مصنف ان کتابوں سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے از راہِ تشکر "حصہ دوم" لکھنے کا ارادہ کیا تا کہ وہ چند نکتے جو اس افادی ادب میں پہلے شامل نہ ہو سکے، اب شریک کر لیے جائیں۔

عظمت کا راز

تاریخ دیکھیے - دنیا کے عظیم ترین انسان غمگین رہتے تھے - کار لائل کا ہاضمہ خراب رہتا تھا - سیزر کو مرگی کے دورے پڑتے تھے - روس کا مشہور زار IVAN نیم پاگل تھا ، خود کشی کی کوشش کرنا کلائیو کا محبوب مشغلہ تھا - کانٹ کو یہ غم لے بیٹھا کہ اس کا قد چھوٹا ہے - یورپ کی کلاسیکی موسیقی بیمار اور بیزار فن کاروں کی مرہون منت ہے - دنیا کا عظیم ادب مغموم موڈ کی تخلیق ہے اور اکثر جیلوں میں لکھا گیا ہے - لہٰذا غمگین ہوئے بغیر کوئی عظیم کام کرنا ناممکن ہے - غم ہی عظمت کا راز ہے —— یا غم آسرا تیرا !

تو پھر آج ہی سے رنجیدہ رہنا شروع کر دیجیے - بہت تھوڑے ملک ایسے ہیں جہاں غمگین ہونے کے اتنے موقعے میسر ہیں جتنے ہمارے ہاں - ابھی چند اشعار پڑھیے - ہماری شاعری ماشاء اللہ حزن و الم سے بھرپور ہے - سوچیے کہ زندگی پیاز کی طرح ہے ، چھیلتے رہیے اندر سے کچھ بھی برآمد نہیں ہوتا - رشتہ داروں اور اُن کے طعنوں کو یاد کیجیے - پڑوسی عنقریب آپ کے متعلق نئی افواہیں اڑانے والے ہیں - جن لوگوں نے آپ سے قرض لیا تھا ، ایک پائی بھی ادا نہیں کی (ویسے جو قرض آپ نے لیا ہے وہ بھی ادا نہیں ہوا) —— زندگی کتنی مختصر ہے ؟ —— مرنے کے بعد کیا ہوگا ؟ —— شام کی گاڑی سے کوئی پندرہ بیس رشتہ دار بغیر اطلاع دیے آ جائیں گے - ان کے لیے بستروں کا انتظام کرنا ہوگا - یہ چشتی صاحب اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں —— ؟ پچھلے ہفتے قطب الدین صاحب نے کھانے پر سارے شہر کو مدعو کیا - سوائے آپ کے —— وغیرہ وغیرہ -

اب آپ غمگین - آہیں بھریے - ماتھے پر شکنیں پیدا کیجیے - ہر ایک سے لڑیے عنقریب آپ اس احساس برتری سے آشنا ہوں گے

جو سدا بیزار رہنے والوں ہی کا حصہ ہے ۔ وہ احساس جو انسان کو نطشے کا فوق الانسان بناتا ہے ۔ اب آپ شاید کوئی عظیم کام کرنے والے ہیں — !

عظیم کام کر چکنے کے بعد اگر موڈ بدلنا منظور ہو تو فوراً بازار سے 'مسرور ہو'، 'مسکراتے رہیے'، یا ایسی ہی کوئی کتاب لے کر پڑھیے اور خوش ہو جائیے ۔

حافظہ تیز کرنا

اگر آپ کو باتیں بھول جاتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ کا حافظہ کمزور ہے ۔ فقط آپ کو باتیں یاد نہیں رہتیں ۔ علاج بہت آسان ہے ۔ آئندہ ساری باتیں یاد رکھنے کی کوشش ہی مت کیجیے ۔ آپ دیکھیں گے کہ کچھ باتیں آپ کو ضرور یاد رہ جائیں گی ۔

بہت سے لوگ بار بار کہا کرتے ہیں — ہائے یہ میں نے پہلے کیوں نہیں سوچا ، اس سے بچنے کی ترکیب یہ ہے کہ ہمیشہ پہلے سے سوچ کر رکھیے اور یا پھر ایسے لوگوں سے دور رہیے جو ایسے فقرے کہا کرتے ہیں ۔ دانشمندوں نے مشاہدہ تیز کرنے کے طریقے بتائے ہیں کہ پہلے پھرتی سے کچھ دیکھیے پھر فہرست بنائیے کہ ابھی آپ نے کیا کیا دیکھا تھا ۔ اس طرح حافظے کی ٹریننگ ہو جائے گی اور آپ حافظ بنتے جائیں گے ۔ للہذا اگر اور کوئی کام نہ ہو تو آج سے جیب میں کاغذ اور پنسل رکھیے ۔ چیزوں کی فہرست بنائیے ۔ اور فہرست کو چیزوں سے ملایا کیجیے — بڑی فرحت حاصل ہو گی ۔

مشہور فلسفی شوپنہار سیر پر جاتے وقت اپنی چھڑی سے درختوں کو چھوا کرتا تھا ۔ ایک روز آسے یاد آیا کہ پل کے پاس جو لمبا سا درخت تھا آسے نہیں چھوا ۔ وہ مرد عاقل ایک میل واپس

گیا اور جب تک درخت چھو نہ لیا اسے سکونِ قلب حاصل نہ ہوا۔

شوپنہار کے نقشِ قدم پر چلیے۔ اس سے آپ کا مشاہدہ اس قدر تیز ہوگا کہ آپ اور سب حیران رہ جائیں گے۔

خوف سے مقابلہ

دل ہی دل میں خوف سے جنگ کرنا بے سود ہے۔ کیونکہ ڈرنے کی ٹریننگ ہمیں بچپن سے ملتی ہے اور شروع ہی سے ہمیں بھوت، چڑیل، ہاؤ اور دیگر چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے تو تاریکی میں جائیے ہی مت۔ اگر اندھیرا ہو جائے تو جلدی سے ڈر کر روشنی کی طرف چلے آئیے۔ آہستہ آہستہ آپ کو عادت پڑ جائے گی اور خوف کھانا پرانی بات ہو جائے گی۔

تنہائی سے خوف آتا ہو تو لوگوں سے ملتے رہا کیجیے۔ لیکن ایک وقت میں صرف ایک چیز سے ڈریے ورنہ یہ معلوم نہ ہو سکے گا کہ اس وقت آپ دراصل کس چیز سے خوفزدہ ہیں۔

وقت کی پابندی

تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اگر آپ وقت پر پہنچ جائیں تو ہمیشہ دوسروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے اکثر دیر سے آتے ہیں۔ چنانچہ خود بھی ذرا دیر سے جائیے۔ اگر آپ وقت پر پہنچے تو دوسرے یہی سمجھیں گے آپ کی گھڑی آگے ہے۔

وہم کا علاج

اگر آپ کو یونہی وہم سا ہوگیا ہے کہ آپ تندرست ہیں تو کسی طبیب سے ملیے، یہ وہم فوراً دور ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ کسی وہمی بیماری میں مبتلا ہیں تو ہر روز اپنے آپ سے کہیے......
میری صحت اچھی ہو رہی ہے........ میں تندرست ہو رہا ہوں۔

احساس کمتری ہو تو بار بار مندرجہ ذیل فقرے کہے جائیں:-

میں قابل ہوں .... مجھ میں کوئی خامی نہیں .... جو کچھ میں نے اپنے متعلق سنا ، سب جھوٹ ہے ـــ میں بہت بڑا آدمی ہوں ۔

بے خوابی سے نجات

اگر نیند نہ آتی ہو تو سونے کی کوشش مت کیجیے ۔ بلکہ بڑے انہماک سے فلاسفی کی کسی موٹی سی کتاب کا مطالعہ شروع کر دیجیے ۔ فوراً نیند آ جائے گی ۔ مجرب نسخہ ہے ۔ ریاضی کی کتاب کا مطالعہ بھی مفید ہے ۔

گفتگو کا آرٹ

جو کچھ کہنے کا ارادہ ہو ضرور کہیے ۔ دوران گفتگو خاموش رہنے کی صرف ایک وجہ ہونی چاہیے ، وہ یہ کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہے ۔ ورنہ جتنی دیر جی چاہے باتیں کیجیے ۔ اگر کسی اور نے بولنا شروع کر دیا تو موقعہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور کوئی دوسرا آپ کو بور کرنے لگے گا (بور وہ شخص ہے جو اس وقت بولتا چلا جائے جب آپ بولنا چاہتے ہوں) ۔

چنانچہ جب بولتے بولتے سانس لینے کے لیے رکیں تو ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیں کہ ابھی بات ختم نہیں ہوئی ۔ یا قطع کلامی معاف کہہ کر پھر سے شروع کر دیجیے ۔ اگر کوئی دوسرا اپنی طویل گفتگو ختم نہیں کر رہا ، تو بے شک جماہیاں لیجیے ، کھانسیے ، بار بار گھڑی دیکھیے .... "ابھی آیا" .... کہہ کر باہر چلے جائیے ، یا وہیں سو جائیے ۔

یہ بالکل غلط ہے کہ آپ لگا تار بول کر بحث نہیں جیت سکتے ۔ اگر آپ ہار گئے تو مخالف کو آپ کی ذہانت پر شبہہ ہو جائے گا ۔ مجلسی تکلفات بہتر ہیں یا اپنی ذہانت پر شبہہ کروانا ؟

البتہ لڑئیے مت کیونکہ اس سے بحث میں خلل آ سکتا ہے ۔

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اسے مت مانیے - لوگ ٹوکیں تو الٹے سیدھے دلائل بلند آواز میں پیش کر کے انھیں خاموش کروا دیجیے ورنہ وہ خواہ مخواہ سر پر چڑھ جائیں گے - دوران گفتگو میں لفظ "آپ" کا استعمال دو یا تین مرتبہ سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے - اصل چیز "میں" ہے - اگر آپ نے اپنے متعلق نہ کہا تو دوسرے اپنے متعلق کہنے لگیں گے -

تربیت اطفال

بچوں سے کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آئیے -

بچے سوال پوچھیں تو جواب دیجیے مگر اس انداز میں کہ دوبارہ سوال نہ کر سکیں - اگر زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجیے جب بڑے ہو گے تو سب پتا چل جائے گا - بچوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیے شاید وہ بزرگوں کا ادب کرنے لگیں - بچوں کو دلچسپ کتابیں مت پڑھنے دیجیے کیونکہ کورس کی کتابیں کافی ہیں -

اگر بچے بیوقوف ہیں تو پروا نہ کیجیے - بڑے ہو کر یا تو جینئس بنیں گے یا اپنے آپ کو جینئس سمجھنے لگیں گے - بچے کو سب کے سامنے کبھی مت ڈانٹیے ، اس کے تحت الشعور پر برا اثر پڑے گا - ایک طرف لے جا کر تنہائی میں اس کی خوب تواضع کیجیے -

بچوں کو پالتے وقت احتیاط کیجیے کہ وہ ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں ورنہ وہ بہت موٹے ہو جائیں گے اور والدین اور پبلک کے لیے خطرے کا باعث ہوں گے -

اگر بچے ضد کرتے ہیں تو آپ بھی ضد کرنی شروع کر دیجیے - وہ شرمندہ ہو جائیں گے -

ماہرین کا اصرار ہے کہ موزوں تربیت کے لیے بچوں کا تجزیہ

نفسی کرانا ضروری ہے ۔ لیکن اس سے پہلے والدین اور ماہرین کا تجزیۂ نفسی کرا لینا زیادہ مناسب ہوگا ۔ دیکھا گیا ہے کہ کنبے میں صرف دو تین بچے ہوں تو وہ لاڈلے بنا دیے جاتے ہیں ۔ للهذا بچے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہییں تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے ۔

اسی طرح آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہیے ۔

نوٹ : اگر اس مضمون سے ایک کا بھی بھلا ہوگا تو مصنف سمجھے گا کہ اس کی ساری محنت بالکل رائیگاں گئی ۔

حمید عسکری

(۱۹۰۹ء تا ۱۹۷۱ء)

جابر بن حیّان: ایک نامور مسلم سائنسدان

یورپ کے تمام محقق اس بات پر متفق ہیں کہ تاریخ میں پہلا کیمیا دان جس پر یہ نام صادق آتا ہے جابر بن حیان تھا۔ اہل یورپ میں وہ جیبر[1] کے نام سے مشہور ہے جو جابر کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے۔

جابر کے زمانے میں کیمیا کی ساری کائنات مہوسی تک محدود تھی۔ یہ وہ علم تھا جس کے ذریعے کم قیمت دھاتوں مثلاً" پارے یا تانبے یا چاندی کو سونے میں منتقل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی اور جو لوگ اس کوشش کو اپنی زندگی کا محور بنا لیتے تھے وہ مہوس کہلاتے تھے۔ جابر اگرچہ یہ یقین رکھتا تھا کہ کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے لیکن اس کی تحقیقات کا دائرہ اس کوشش رائیگاں سے کہیں زیادہ وسیع تھا۔ وہ کیمیا کے تمام تجرباتی عملوں مثلاً حل کرنا، فلٹر کرنا، کشید کرنا، عمل تصعید[2] سے اشیا کا جوہر اڑانا اور قلماؤ[3] کے ذریعے اشیا کی قلمیں بنانا

۱- Geber

۲- Sublimation

۳- Crystallization

ان سب سے نہ صرف واقف تھا بلکہ اپنے کیمیائی تجربوں میں ان سے بہ کثرت کام لیتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ تجرباتی کیمیا کا بانی ہے اور یہی وہ خصوصیت ہے جس کے باعث اس کا شمار قدیم زمانے کے ممتاز سائنس دانوں میں ہوتا ہے۔

اپنی ایک کتاب میں وہ لکھتا ہے:

"کیمیا میں سب سے ضروری شے تجربہ ہے۔ جو شخص اپنے علم کی بنیاد تجربے پر نہیں رکھتا وہ ہمیشہ غلطی کرتا ہے، پس اگر تم کیمیا کا صحیح علم حاصل کرنا چاہتے ہو تو تجربوں پر انحصار کرو اور صرف اس علم کو صحیح جانو جو تجربے سے ثابت ہو جائے۔ ایک کیمیا دان کی عظمت اس بات میں نہیں ہے کہ اس نے کیا کچھ پڑھا ہے بلکہ اس بات میں ہے کہ اس نے کیا کچھ تجربے کے ذریعے ثابت کیا ہے۔"

دھاتوں کے متعلق جابرؒ کا نظریہ یہ تھا کہ تمام دھاتیں گندھک اور پارے سے بنی ہیں۔ جب دونوں اشیاء بالکل خاص حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ کیمیائی ملاپ کرتی ہیں تو سونا پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ نا خالص حالت میں کیمیائی طور پر ملتی ہیں تو دیگر کثافتوں کی موجودگی اور ان کی مقدار کی کمی بیشی سے دوسری دھاتیں مثلاً چاندی، سیسہ، تانبہ لوہا وغیرہ ظہور میں آتی ہیں۔ اس نظریے کے مطابق چونکہ دیگر دھاتوں اور سونے کی کیمیائی ترکیب میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے اس لیے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر لینا عین ممکن ہے۔ دھاتوں کے متعلق جابر کا یہ نظریہ کم و بیش اٹھارویں صدی تک قائم رہا۔ چنانچہ آنے والی صدیوں میں ہزاروں انسان اپنی ساری عمر کو گوگرد احمر یعنی سرخ گندھک کی تلاش میں صرف کرتے رہے جو گندھک کی خالص قسم سمجھی جاتی تھی اور اس لیے اس کے متعلق

خیال کیا جاتا تھا کہ اسے پارے کے ساتھ گرم کر کے سونا بنایا جا سکتا ہے - یہ امر بظاہر حیران کن نظر آتا ہے کہ خود جابر نے اس طور سے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی چنداں کوشش نہیں کی - اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بعض ابتدائی تجربوں سے جان گیا تھا کہ گندھک اور پارے کو ملا کر سونا بنانے کی کوشش بھی نا معلوم وجوہ سے عملی طور پر کامیاب نہیں ہو سکتی - اپنی ایک کتاب میں وہ لکھتا ہے :

" میں نے جتنی بار بھی گندھک اور پارے کے کیمیائی ملاپ کی کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں ہمیشہ شنگرف[1] حاصل ہوا ہے - میرا خیال ہے کہ وہ گندھک جس کو پارے کے ساتھ کیمیائی طور پر ملانے سے سونا بنتا ہے اس عام گندھک کے علاوہ کوئی اور شے ہے -"

جابر کے اس بیان سے بعد کے لوگوں نے اس فرضی گندھک کا نام گوگرد احمر رکھ لیا تھا جس کی تلاش میں وہ اپنی ساری عمر اور اپنے سارے وسائل صرف کر دیتے تھے لیکن یہ گوگرد احمر حقیقت میں کسی شخص کو نہ مل سکی -

عمل تکلیس جسے عام زبان میں دھات کا کشتہ بنانا کہتے ہیں وہ عمل ہے جس کے ماتحت ایک دھات کو گرمی پہنچا کر اس کا اوکسائڈ (اور بعض حالتوں میں اس کا کوئی اور مرکب) تیار کیا جاتا ہے جابر اس عمل سے بخوبی واقف تھا - چنانچہ اس نے اس خاص عمل پر ایک جامع کتاب تصنیف کی ہے جس میں اس نے دھاتوں کے مرکبات یعنی کشتے بنانے کے طریقے وضاحت کے ساتھ بیان کیے ہیں -

اس نے اپنی کیمیا کی کتابوں میں فولاد بنانے ، چمڑے کو

Cinnabar - ۱

رنگنے ، دھاتوں کو مصفا کرنے ، موم جامہ بنانے ، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لیے اس پر وارنش کرنے ، بالوں کو سیاہ کرنے کے لیے خضاب تیار کرنے اور اس قسم کی بیسیوں مفید اشیا بنانے کے طریقے بیان کیے ہیں - ان اشیاء کی تیاری موجودہ زمانے میں بھی کافی مشکل سمجھی جاتی ہے اور اسے سرانجام دینے کے لیے بہت زیادہ فنی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے - اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ایک ایسے زمانے میں جب کیمیا کا علم موجودہ زمانے کی نسبت بے حد محدود تھا جابر کے لیے ان کارآمد اشیا کا تیار کر لینا صنعتی کیمیا میں اس کے اعلیٰ علم اور بے مثل فنی مہارت کی دلیل ہے -

آلاتِ کیمیا میں قرع و انبیق جابر کی خاص اور قابل قدر ایجاد ہے جس سے کشید کرنے ، عرق کھینچنے اور ست یا جوہر نکالنے کا کام لیا جاتا تھا - یہ آلہ دو علاحدہ علاحدہ برتنوں پر مشتمل ہوتا تھا جن میں سے ایک کو قرع اور دوسرے کو انبیق کہتے تھے - قرع عموماً ایک صراحی کی شکل کا ہوتا تھا جس کی گردن چوڑی مگر چھوٹی ہوتی تھی - انبیق بھبکے کی شکل کا تھا جس کے پہلو میں ایک لمبی نالی لگی ہوتی تھی - یہ دوسرا حصہ (یعنی انبیق) پہلے حصے (یعنی قرع) کے اوپر صحیح طور سے آ جاتا تھا اور اس میں پھنس جاتا تھا - قرع اور انبیق دونوں بہت اعلیٰ چکنی مٹی کے بنائے جاتے تھے اور انھیں خاص طریقوں سے پکایا جاتا تھا - جب قرع و انبیق سے کسی مائع کو کشید کرنا ہوتا تو اسے قرع میں ڈال دیا جاتا یا اگر کسی شے کا عرق نکالنا ہوتا تو اسے بھی پانی میں بھگو کر قرع میں بھر دیا جاتا پھر اس کی گردن میں انبیق کو الٹا کر کے لگا دیا جاتا اور دونوں کے مقام اتصال کو ہوا روک[1] بنانے کے لیے وہاں گندھے ہوئے آٹے یا بھیگی ہوئی گاچنی مٹی کی

Air tight - ۱

لیپ کر دی جاتی - اس کے بعد قرع کو اسی حالت میں چولھے پر رکھ کر آگ سے حرارت پہنچائی جاتی - حرارت کے اثر سے ان اشیاء میں سے ، جو قرع کے اندر پڑی ہوتیں ، بخارات اٹھنے شروع ہو جاتے یہ بخارات انبیق میں داخل ہو کر اس کی لمبی نالی سے نکلتے - اس نالی کے ساتھ ایک بوتل لگا دی جاتی اور بوتل کے بیرونی حصے کو ٹھنڈے پانی میں ڈبو کر رکھ دیا جاتا - بوتل کے اندر ٹھنڈک سے یہ بخارات دوبارہ مائع بن جاتے یہی مائع قرع میں ڈالی ہوئی اشیاء کا عرق یا جوہر یا عطر ہوتا تھا -

جابر نے شورے کے تیزاب کو جو اس کی اہم ترین دریافتوں میں سے ہے اس قرع و انبیق کی مدد سے بنایا تھا - موجودہ زمانے میں شورے کے تیزاب کو تیار کرنے کا طریقہ جسے تجربہ گاہوں میں برتا جاتا ہے یہ ہے کہ ایک ریٹارٹ میں جو فی الحقیقت قرع و انبیق ہی کی ترمیم شدہ صورت ہے قلمی شورہ ڈال کر اس میں گندھک کا تیزاب ملا دیا جاتا ہے - پھر ریٹارٹ کو آگ کی حرارت پہنچائی جاتی ہے - جس سے گندھک کا تیزاب کیمیائی طور پر شورے پر عمل کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں شورے کا تیزاب اور ایک ٹھوس مرکب جسے کیمیا کی زبان میں پوٹاشیم سلفیٹ کہتے ہیں بنتے ہیں - پوٹاشیم سلفیٹ تو ریٹارٹ میں ہی رہتا ہے مگر شورے کے تیزاب کے بخارات ریٹارٹ کی گردن میں سے باہر نکل کر ایک صراحی میں چلے جاتے ہیں جس کے اندر ریٹارٹ کی گردن داخل کی ہوتی ہے اس صراحی کو پانی میں رکھا جاتا ہے جس کے باعث تیزاب کے بخارات دوبارہ ٹھنڈے ہو کر مائع بن جاتے ہیں - صراحی میں جمع شدہ یہی مائع شورے کا تیزاب ہوتا ہے -

جابر نے شورے کے تیزاب کی تیاری میں گندھک کے تیزاب کو براہ راست استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اس مقصد کے لیے اس نے عام

دستیاب ہونے والی تین چیزوں یعنی پھٹکڑی[1] ، ہیرا کسیس[2] اور قلمی شورے[3] سے کام لیا تھا - اپنی ایک کتاب میں وہ قلمی شورے کی تیاری کے حال میں لکھتا ہے :-

"میں نے قرع میں کچھ پھٹکڑی ، ہیرا کسیس اور قلمی شورہ ڈالا اور اس کے منہ کو انبیق سے بند کر کے اسے کوئلوں کی آگ پر رکھ دیا - تھوڑے عرصے کے بعد میں نے دیکھا کہ حرارت کے عمل سے انبیق کی نلی میں سے بھورے رنگ کے بخارات نکل رہے تھے - یہ بخارات بیرونی برتن میں جو تانبے کا تھا داخل ہو کر مائع حالت میں بدل جاتے تھے لیکن یہ مائع اتنا تیز تھا کہ اس نے تانبے کے برتن میں سوراخ پیدا کر دیے - میں نے اس کو چاندی کی کٹوری میں جمع کرنے کی کوشش کی لیکن اس میں بھی اس مائع سے سوراخ پڑ گئے - چمڑے کی تھیلی میں بھی اس مائع نے چھید ڈال دیے - خود قرع و انبیق کو بھی اس سے نقصان پہنچا اور اس کا رنگ اتر گیا - میں نے اس مائع کو انگلی لگائی تو میری انگلی جل گئی اور مجھے کئی روز تک تکلیف رہی - میں نے اس مائع کا نام تیزاب رکھا ہے اور چونکہ اس کی تیزی میں قلمی شورے کا جزو غالب ہے اس لیے اس کو قلمی شورے کا تیزاب کہنا مناسب ہو گا - عام اشیاء میں سے ایک سونا اور دوسرا شیشہ یہی دو چیزیں مجھے ایسی مل سکی ہیں جن پر اس تیزاب کا کچھ اثر نہیں ہوتا -"

اس کامیابی سے متأثر ہو کر جابر نے ان تجربات کو جاری رکھا اور قرع و انبیق کے اس طریقے سے پھٹکڑی اور ہیرا کسیس کو حرارت پہنچا کر ایک اور مائع حاصل کیا - یہ شربت کی طرح

---

۱ - Alum

۲ - Ferrous Sulphate

۳ - Nitre

گاڑھا تھا اور اس کی دھار تیل کی سی تھی۔ اس لیے جابر نے اس کا نام ہیرا کسیس کا تیل رکھا۔ یہ مائع کاغذ کو گلا دیتا تھا اور جب اس کو کھانڈ پر ڈالا جاتا تھا تو کھانڈ کا رنگ سیاہ ہو جاتا تھا۔ پانی ملانے سے اس مائع میں بہت زیادہ حرارت پیدا ہوتی تھی جس کے باعث اس کا ٹمپریچر بڑھ جاتا تھا۔ یہ مائع بھی ایک قسم کا تیزاب تھا جو شورے کے تیزاب جتنا تیز نہ تھا مگر سرکہ اور لیموں کے رس سے بہت زیادہ طاقتور تھا۔ موجودہ زمانے میں اس تیزاب کو گندھک کا تیزاب یا سلفیورک ایسڈ کہتے ہیں اور اسے گندھک سے براہ راست حاصل کیا جاتا ہے۔ لیکن جابر کو یہ علم نہ تھا کہ اس کا گندھک کے ساتھ کوئی تعلق ہے۔ وہ اسے ہیرا کسیس کا تیل ہی کہتا تھا۔

جابر شیر خوارگی ہی میں یتیم ہو گیا تھا اس کا باپ حکومت کا مغضوب تھا اور بغاوت کے جرم میں قتل ہوا تھا۔ اس کی تربیت عرب کے ایک دور افتادہ علاقے کے ایک بدوی قبیلے میں ہوئی تھی جہاں اس نے اپنے بچپن اور جوانی کے ایام گزارے تھے۔ یہ تینوں امور ایسے تھے جن کے باعث اس زمانے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی موقع اسے میسر نہیں آ سکتا تھا۔ لیکن ان ناسازگار حالات کے باوجود اس نے اپنی محنت، قابلیت اور ذہانت سے سائنس میں اپنے لیے اتنا اونچا مقام حاصل کر لیا جو اس کے زمانے میں کسی اور کو حاصل نہ ہوا تھا۔

آفتاب حسن

(ولادت : ۱۹۰۹)

پٹرولیم

ہماری زمین انمول خزانوں سے بھری پڑی ہے اور ان خزانوں سے جو دولت نکلتی ہے اس میں پٹرولیم ایسی شے ہے جس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے - جدید دنیا در اصل مشین کی دنیا ہے - مشین قوت سے چلتی ہے - مشینوں کو قوت پہنچانے کے لیے اس وقت تین اہم ذریعے ہیں بجلی ، کوئلہ اور پٹرول - بجلی ایک جگہ قائم رہنے والی مشینوں کے لیے بہت موزوں ہے - حمل و نقل کی مشینوں میں بھی بجلی استعمال ہوتی ہے لیکن اس کے لیے تار کی ضرورت ہے - یہ لازمی ہے کہ مشینوں کا تعلق تار کے ذریعے بجلی کے کارخانوں سے رہے - سردست یہ ممکن نہیں ہے بجلی کی بڑی مقدار کو جمع کر کے رکھا جائے اور اس سے موٹر اور ہوائی جہاز چلائے جائیں - کوئلہ عام طور پر کارخانوں ، جہازوں اور ریلوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اس میں مصیبت یہ ہے کہ قوت کی مناسبت سے اس میں وزن زیادہ ہوتا ہے - تیز رو اور ہلکی مشینوں میں یہ کام نہیں دے سکتا - اب رہ گیا پٹرول - یہی وہ صاف ستھری جلد بھڑک اٹھنے والی چیز ہے جو مشینوں کے جسم میں خون کی حیثیت رکھتی ہے - دنیا کی تیز

ترین مشینیں اس سے چلتی ہیں - ہوائی جہاز ، موٹریں اور طرح طرح کی گاڑیاں اس کے بل پر طول طویل فاصلے پل بھر میں طے کر لیتی ہیں -

خشکی ، تری اور ہوا میں جب کسی مشین کو آپ حرکت کرتے ہوئے دیکھیں تو یقین کیجیے کہ اس میں پٹرولیم کسی نہ کسی صورت میں استعمال ہو رہا ہے - اگر ایندھن کی حیثیت سے نہیں تو کم از کم چکنائی کی حیثیت سے - کیوں کہ پٹرولیم سے ایسے گاڑھے تیل بھی نکلتے ہیں جن سے مشینوں کے مختلف حصوں کو چکنا کرکے ان کی مزاحمت کو کم کرنے کا کام لیا جاتا ہے -

پٹرولیم کو معدنی تیل بھی کہا جاتا ہے کیوں کہ تیل اور ذریعوں سے بھی حاصل ہو سکتا ہے - پودوں میں سے جو تیل حاصل ہوتا ہے اسے نباتاتی تیل کہتے ہیں - حیوانوں سے بھی تیل حاصل ہوتا ہے - اس کو چربی کا نام دیا گیا ہے - پٹرولیم کو معدنی تیل یوں کہا جاتا ہے کہ وہ زمین سے نکلتا ہے -

پرانے لوگ پٹرولیم سے واقف تھے : پٹرولیم کوئی نئی دریافت نہیں ہے - پرانے لوگ اس سے واقف تھے - انجیل میں اس کا ذکر موجود ہے - قدیم مؤرخ ہیروڈوٹس ، بابل کے قریب ایک تیل کے چشمے کا ذکر کرتا ہے - یہی مؤرخ بیان کرتا ہے کہ جزیرۂ زانٹے میں بھی ایک تیل کا چشمہ ہے - خاص بات یہ ہے کہ دو ہزار سال گزر گئے لیکن زانٹے میں اب بھی تیل کا چشمہ موجود ہے -

بلنیاس (پلینی) نے صقلیہ میں معدنی تیل کی موجودگی کا ذکر کیا ہے - پرانی جاپانی اور چینی کتابوں میں بھی جگہ جگہ معدنی تیل کا بیان ہے - مشہور سیاح مارکو پولو اپنے سفر نامے میں باکو کے قریب تیل کے چشموں کا بڑی تفصیل سے ذکر کرتا ہے - اس کا بیان ہے کہ صرف ایک چشمے سے تیل اس قدر نکلتا ہے کہ اس

سے سو جہازوں کو بھرا جا سکتا ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ مار کو پولو یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ تیل کھانے کے لائق نہیں ، اس کو صرف جلانے کے کام میں لایا جا سکتا ہے ۔

پرانے لوگ تیل کو جلانے کے علاوہ دوا کے کام میں لایا کرتے تھے ۔ زخموں کو اچھا کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔ پٹرولیم سے جب تمام آسانی سے بخارات میں تبدیل ہو جانے والے اجزاء نکل جاتے ہیں ، تو ایک گاڑھی شے بن جاتی ہے ۔ اس کو قیر (پچ) کہتے ہیں ۔ اس کو قدیم زمانہ میں کشتیوں کو پانی کے اثر سے محفوظ کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا ۔

چینی لوگ عیسٰی علیہ السلام کی پیدائش سے بہت پہلے زمین کو کھود کھود کر تیل نکالا کرتے تھے ۔ برما میں ایراودی ندی کے کنارے جو چشمے ہیں ، بہت قدیم ہیں ۔ آج بھی زبردست برموں سے کھودے ہوئے کنوؤں اور جدید آلات سے مزین کارخانوں کے پہلو بہ پہلو ہاتھ سے کھودے ہوئے تیل کے کنوئیں موجود ہیں جن سے برمی لوگ تیل نکالا کرتے ہیں ۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ زمین کے اندر یہ تیل کہاں سے آ گیا ؟

زمین کے اندر تیل کس طرح بنا : کیمیاوی نقطۂ نگاہ سے پٹرولیم ایک بہت سادی چیز ہے ۔ یہ صرف دو عناصر کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے ۔ ہائیڈروجن اور کاربن کے مرکب کو کیمیا کی زبان میں ہائیڈرو کاربن کہتے ہیں ۔ پٹرولیم مختلف قسم کے ہائیڈرو کاربنوں کا ایک آمیزہ ہے ۔ اس سوال کا کہ زمین کے اندر یہ ہائیڈرو کاربن کہاں سے آ گئے ، قطعی جواب دینا مشکل ہے ۔ ناظرین کو تعجب ہو گا کہ گو پٹرولیم کی صنعت اس قدر اہم ہے کہ دنیا کی اکثر مشینوں میں اس کی ضرورت کسی نہ کسی شکل میں پیش آتی ہے ، اور اس کو دریافت ہوئے بھی کافی عرصہ ہو

چکا ، لیکن لوگوں کو ابھی تک قطعی طور پر نہیں معلوم کہ یہ چیز کس طرح وجود میں آئی - بات ہے تعجب انگیز ، لیکن واقعہ یہی ہے - ابھی تک اس کے متعلق کوئی نظریہ پیش نہیں کیا جا سکا ہے ، جس کے بارے میں یہ کہا جائے کہ یہ قطعی صحیح ہے -

مختلف لوگ مختلف خیال رکھتے ہیں - پرانے لوگوں کا ایک گروہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ پٹرول کا کاربن اور ہائیڈروجن معدنیات سے آیا ہے - زمین کے اندر یہ عناصر مختلف مرکبات کی شکل میں موجود ہیں - انہیں مرکبات پر زمین کا زبردست دباؤ پڑا - اندرونی حرارت کا اثر اور لاکھوں سال اس حالت میں رہنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کاربن اور ہائیڈروجن کے جوہر آپس میں ملے اور ہائیڈرو کاربن تیار ہوا - اس نظریے کو غیر نامیاتی نظریہ کہتے ہیں - اگر یہ نظریہ صحیح ہوتا تو دنیا والوں کی بڑی خوش قسمتی ہوتی ، کیونکہ اس کے معنی یہ ہوے کہ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور پٹرولیم ختم ہو جانے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے - لیکن افسوس ہے کہ یہ نظریہ زیادہ قابل قبول نہیں ہے - اس کی صحت پر بہت کم لوگ یقین رکھتے ہیں -

کثرت رائے نامیاتی نظریے کی طرف ہے - اس نظریے کے مطابق پٹرولیم کے کاربن اور ہائیڈروجن کے ماخذ مردہ معدنی اشیاء نہیں بلکہ نہایت ہی ننھے ننھے حیوانی اور نباتاتی جان دار ہیں -

یہ جو سنگ مرمر ، ریت ، پتھر ، چونا پتھر ، شیل اور دوسرے قسم کے تہ بہ تہ جمے ہوے پتھر ہمیں زمین پر نظر آتے ہیں ، ان کو رسوبی چٹانیں کہا جاتا ہے - یہ چٹانیں اب تو خشکی میں ہیں لیکن دراصل یہ سمندر کی تہ میں لاکھوں سال کے عمل سے تیار ہوئی ہیں - آج سے کروڑوں سال پہلے زمین کی حالت مختلف تھی - آج جہاں خشکی ہے ، لوگ رہتے بستے ہیں ، وہاں سمندر ٹھاٹھیں مارتا تھا ، اور جہاں سمندر پھیلا ہوا ہے ، وہاں گھنے جنگل اور

پہاڑ اپنے زمانے کے جانوروں سے بھرے ہوئے تھے۔

بارش کے سبب نالے ، ندیاں ، دریا خشکی سے ریت اور مٹی کی بڑی بڑی مقداریں سمندر میں بہا کر لاتے رہتے ہیں۔ یہ مٹی سمندر کی تہ میں آہستہ آہستہ بیٹھتی جاتی ہے اور پانی کے بہاؤ اور مدو جزر کے سبب سمندر کی تہ میں یکساں طور پر پھیل جاتی ہے۔ یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس مٹی کی تہ پر اوپر سے اور زیادہ مٹی آ جاتی ہے۔ اس طرح یہ تہ موٹی ہوتی رہتی ہے۔ اس کا بوجھ بڑھنے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نیچے کی تہیں دب کر پتلی ہوتی جاتی ہیں اور ان میں سختی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ پتھر کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔

زمین گو دیکھنے میں ٹھوس قسم کی چیز معلوم ہوتی ہے لیکن اس کو اندر اور باہر کہیں بھی قرار نہیں ہے۔ اس کے اندرونی مادے میں ہلچل سی مچی رہتی ہے۔ کبھی اس کی سطح دبتی رہتی ہے ، کبھی اٹھ جاتی ہے۔ ان سطحی حرکات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی کبھی سمندر کی سطح بلند ہو کر خشک زمین بن جاتی ہے اور اس کا پانی بہہ کر کسی خشک زمین کو غرق کرکے سمندر بنا دیتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ہم خشک زمین پر ، کبھی سطح کے اوپر اور کبھی سطح کے نیچے پتھروں کی تہ پرِ جمی ہوئی چٹانیں دیکھتے ہیں۔

نامیاتی نظریے والوں کا خیال ہے کہ دریا کی مٹی کے ساتھ بے شمار ننھے ننھے جاندار (حیوانی اور نباتاتی) بھی سمندر میں داخل ہوتے رہتے ہیں اور خود سمندر میں بھی اس قسم کے جانداروں کی بڑی کثرت ہوتی ہے جو مر مر کر اس کی تہ میں بیٹھتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ننھے نامیے بہت بڑی مقدار میں سمندر کی تہ میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ جب اوپر ایک اور تہ آ جاتی ہے تو گویا وہ

دفن ہو جاتے ہیں ، اور باہر کی ہوا سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور سمندر کا نمکین پانی ان کر سڑنے گلنے سے بھی بچائے رکھتا ہے - پھر اندرونی حرارت اور زبردست دباؤ کے تحت ان کی آہستہ آہستہ تحلیل شروع ہو جاتی ہے - لاکھوں لاکھ سال یہ عمل قائم رہتا ہے اس کا نتیجہ آخر کار پٹرولیم کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے - پٹرولیم اس طرح تیار ہو کر یکساں طور پر مٹی کی تہ میں پھیل جاتا ہے - لیکن جب اور زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو مٹی کی تہ دب کر شیل بن جاتی ہے اور اس سے تیل نچڑ کر ایسے حصوں میں جو زیادہ مسام دار ہوں ، مثلاً جہاں ریت ہو ، جمع ہو جاتا ہے - ریت کے ذرات کے درمیان تیل جمع رہنے کی بہت جگہ ہوتی ہے -

نامیاتی نظریے کے ماننے والوں کے تین گروہ ہیں - ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ تیل صرف ننھے ننھے (خوردبینی) کیڑوں کی تحلیل سے پیدا ہوتا ہے - دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ ننھے ننھے پودوں کے سبب سے اور تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس میں دونوں قسم کے جانداروں کا حصہ ہے -

کن جگھوں میں تیل پایا جاتا ہے : اب سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ خطۂ زمین پر کون کون سی ایسی جگھیں ہیں جہاں تیل پایا جا سکتا ہے اور کہاں اس کے موجود ہونے کے امکان نہیں ہیں - یہ تو ظاہر ہے کہ زمین کے ہر حصے میں پٹرول پائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے اور اگر کسی حصے میں پٹرول کسی زمانے میں تیار ہوا بھی ہو تو اس کا موجود رہنا کوئی ضروری نہیں ہے ، کیوں کہ جب تک اس کے جمع رہنے اور محفوظ رکھنے کا کوئی سامان نہ ہو تیل کا ضائع ہو جانا یقینی ہے -

سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تیل کے پائے جانے کے لیے یہ لازمی ہے کہ اس جگہ مسام دار چٹانیں موجود ہوں جن میں تیل

جمع رہے - دوسری ضروری چیز ایک غیر مسام دار چٹان ہے جو مسام دار تہ کے اوپر ہو اور تیل کو محفوظ رکھ سکے - اکثر تیل کی سطح کے نیچے سے پانی بڑے دباؤ کے تحت اوپر اٹھنا شروع ہوتا ہے اور تیل کو اپنے آگے دھکیلتا جاتا ہے - اگر غیر مسام دار چٹان اس کے اوپر موجود نہ ہو تو تیل اوپر اٹھتے اٹھتے سطح زمین پر آ جائے گا اور ضائع ہو جائے گا - تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ زمین کی اندرونی بناوٹ ایسی ہونی چاہیے کہ تیل دور دور سے سمٹ کر ایک جگہ جمع ہو جائے - ایسا نہ ہو تو تیل کا حاصل کرنا ناممکن ہو جائے - اگر تیل موجود ہو ، لیکن سیکڑوں میل میں پھیلا رہے ، تو اس کا نکالنا اور حاصل کرنا ناممکن ہو جائے چوتھی اور سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ایسا ماخذ ہونا چاہیے جس سے تیل نکل سکے - کیونکہ جب تک کوئی خطہ ایسا نہ ہو جس میں کسی زمانے میں تیل تیار ہوا ہو ، جس سے تیل نکل کر موزوں مقامات پر جمع ہو سکے ، باقی سب چیزوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے - جب تک یہ چاروں چیزیں ایک جگہ نہ پائی جائیں ، تیل پائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے -

زمین کے بہت سے حصے ایسے ہیں جو بڑی سخت آتش فشانی چٹانوں سے بنے ہوئے ہیں - یہ چٹانیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے ، زمین کے اثرات کے سبب سے بنتی ہیں - آتش فشاں دھاتوں سے جو مادہ اندر ہی اندر جم جاتا ہے ، وہ سنگ خارا اور دوسرے سخت پتھروں کی شکل میں نظر آتا ہے - ان کے علاوہ ایسی بھی چٹانیں ہیں جن کی حالت بالکل بدلی ہوئی ہوتی ہے - ابتداء میں جو حالت ہوتی ہے وہ آتش فشانی یا دوسرے اسباب کے سبب بالکل بدل جاتی ہے - ایسے خطوں میں تیل کی تلاش بیکار ہے جہاں تیل پایا نہیں جا سکتا - افسوس اس بات کا ہے کہ سطح زمین کا تقریباً آدھا حصہ اس قسم کی چٹانوں سے بنا ہے - اس لیے جب تیل

ڈھونڈنا ہو تو صرف ایسی جگھیں دیکھی جائیں جہاں رسوبی چٹانیں موجود ہوں یا قریب میں ہوں - جہاں آتش فشانی چٹانیں نہ ہوں - ریت پتھر ، چونے کا پتھر ، یا ریت یا اسی قسم کی دوسری ایسی تہ موجود ہو جہاں تیل جمع رہ سکے - پھر یہ دیکھنا چاہیے کہ زمین کے اندر کوئی حصہ ایسا ہے یا نہیں جہاں تیل تیار ہوا ہو - ارضیات کا ماہر سطح کے اندر سے نکالی ہوئی مٹی اور پتھر کا امتحان کرکے یہ بتا سکتا ہے - اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ زمین کی بناوٹ ایسی ہے یا نہیں کہ اس میں دور دور سے تیل آ کر ایک محدود علاقے میں جمع ہو سکے اور مسام دار تہ کے اوپر ایک غیر مسام دار تہ بھی موجود ہے یا نہیں - یہ سب باتیں موجود ہوں تو تیل کا پایا جانا ضروری ہے -

جب زمین کے کسی حصے میں تیل تیار ہو چکا ہے تو پہلے وہ اس جگہ ، جیسا کہ اس سے قبل بتایا جا چکا ہے ، مٹی کی تہ میں پھیلا رہتا ہے - اس وقت اس کا حاصل کرنا ممکن نہیں ہے - لیکن جب مٹی کی تہ پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو یہ دب جاتی ہے اور تیل اس سے باہر نکل کر زیادہ مسام دار اور کم دبنے والے حصوں ، مثلاً ریت وغیرہ کی تہ میں چلا جاتا ہے - پھر چٹانوں کے دباؤ ، پانی کے دباؤ ، اندرونی سطح کی تبدیلیوں یا کسی اور سبب سے تیل اپنی جگہ سے حرکت کرنا شروع کرتا ہے اور اس جگہ جمع ہونے لگتا ہے جہاں سے وہ نکل نہیں سکتا -

ارضیاتی تبدیلیوں اور زمین کی سطحی حرکات کے سبب اس کی تہوں میں شکنیں پڑ جاتی ہیں اور جگہ جگہ تہ بہ تہ اٹھ کر کوہان اور گنبد نما بن جاتی ہے اور یہی حصے آئندہ تیل کے ماخذ بن جاتے ہیں - تیل نیچے سے اٹھتا ہوا غیر مسام دار سطح تک پہنچ جاتا ہے ، اور پھر اس کے نیچے نیچے چلتا گنبدوں تک پہنچ جاتا ہے -

نیچے کا پانی اس کو دھکیل کر گنبد کے اندر داخل کر دیتا ہے ۔ گنبد کے اندر تیل محفوظ ہو جاتا ہے ، کیونکہ یہ نہ اب نیچے ہی آ سکتا ہے نہ آزو بازو سے نکل سکتا ہے ۔ گنبد کا لفظ مثال کے طور پر استعمال کیا گیا ہے ، تاکہ تہوں کا خم سمجھ میں آ جائے۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ تیل جن گنبدوں میں مقید ہوتا ہے وہ بھی ہماری عمارتوں کے گنبد جیسے چھوٹے ہوتے ہیں ۔

جہاں تیل ہوتا ہے وہاں گیس بھی ضرور ہوتی ہے ۔ لیکن یہ لازمی نہیں ہے کہ جہاں گیس ہو وہاں سے تیل بھی نکلے ۔ اکثر جگہ زمین میں سوراخ کرنے سے صرف گیس نکلتی ہے ۔ وہاں تیل کا نام بھی نہیں ہوتا ۔ گنبد کے اندر گیس ، تیل اور پانی اپنی اپنی کثافت کے لحاظ سے جمع ہو جاتے ہیں ۔ گیس سب سے ہلکی ہوتی ہے اس لیے اوپر رہتی ہے ، اس کے نیچے تیل ہوتا ہے اور سب سے نیچے پانی ۔ پاکستان میں سوئی گیس بلوچستان کے علاقے میں تیل تلاش کرتے ہوئے اسی طرح اتفاقیہ دریافت ہو گئی ۔

یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جن جگھوں میں تیل جمع رہتا ہے ان کی حیثیت تالاب کی سی نہیں ہوتی کہ جن میں تیل بھرا ہوا موجود ہو ۔ یہ جگھیں در اصل مسام دار چٹانوں یا ریت وغیرہ سے بھری ہوئی ہیں اور انھیں میں تیل موجود رہتا ہے ۔

نظمیں

نظیر اکبر آبادی

(۱۷۳۵ تا ۱۸۳۰)

انجام

بٹ مار اجل کا آ پہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا
اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے بے بس جی مار مرو بابا
جب باپ کی خاطر روتے تھے اب اپنی خاطر رو بابا

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو
خیرات کرو، احسان کرو، یا پُن کرو یا دان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ، یا خاصہ حلوا مان کرو
کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب چلنے کا دھیان کرو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

گر اچھی کرنی نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے
تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے
اور ایسی دولت چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤ گے
کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو، یہ ہر دم تن کو چنتی ہے
جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات وہ لکڑی گھنتی ہے
تم گٹھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنتی ہے
اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بابا بنتی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

بیوپار تو یاں کا بہت کیا اب واں کا بھی کچھ سودا لو
جو کھیپ اُدھر کو چڑھتی ہے اس کھیپ کو یاں سے لدوا لو
اُس راہ میں جو کچھ کھاتے ہوں، اُس کھانے کو بھی منگوا لو
سب ساتھی پہنچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستہ لو

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کھو بابا

دو چار گھڑی یا دو دن میں، اب تن سے جان نکلنی ہے
یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا گھلنی ہے یا جلنی ہے
ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں وہ بھی ڈھلنی ہے
اٹھ باندھ لو کمر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

میر ببر علی انیس

(۱۸۰۲ تا ۱۸۷۴)

دنیا

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں
وہ گُل ہے یہ گُل بوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست، مروت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد، حلاوت نہیں جس میں
بے درد و الم شامِ غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

اس منزلِ فانی پہ نہ دل اپنا لگاؤ
الفت نہ کرو اُس سے جسے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے یہاں گھر نہ بناؤ
پابندیٔ دنیا سے بس اب ہاتھ ہٹاؤ
چلتے ہوئے ہرگز کوئی کام آ نہ سکے گا
ہمراہ کچھ اسبابِ جہاں جا نہ سکے گا

یاں رختِ اقامت کا سر انجام ہے بے جا
اس منزلِ پُر خوف میں آرام ہے بے جا
عقبیٰ کے سوا یاں کا، ہر اک کام ہے بے جا
مانندِ نگیں آرزوے نام ہے بے جا

سینے میں یہ دم مثلِ چراغِ سحری ہے
کر لو عملِ خیر، یہی ناموری ہے

امید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام
ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لبِ بام
یاں کام کرو ایسا کہ جو آئے وہاں کام
آ جائے خدا جانیے کب موت کا پیغام

اپنی نہ کوئی مِلک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمھیں خاک، یہ سب خاک سمجھنا

بھائی نہ تو کام آئے گا اُس وقت نہ فرزند
عرصہ نہیں، کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضامند
ہشیار کہ ہونا ہے تمھیں خاک کا پیوند

پیری کی بھی مدت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہِ شاہ و گدا کنج لحد ہے

ہیں زیرِ زمیں صاحبِ تخت و عَلَم و تاج
جو صاحبِ نوبت تھے، نشاں ان کے نہیں آج
جو شاہ کہ لیتے رہے شاہوں سے سدا باج
وہ بعد فنا آپ، کفن کے رہے محتاج

درویش و غنی اس کے ہمیشہ رہے شاکی
بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی؟

غربت

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہو، پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

گو راہ میں ہم راہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگیِ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل، مثلِ جرس کرتا ہے فریاد
اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ملتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ملتی

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے
درماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی بیٹھے، تو اٹھاتا نہیں کوئی

کتنے ہیں مسافر کہ نہ پھر آئے سفر سے
جنگل میں عزیزوں کو اجل لے گئی گھر سے
رک جاتی ہے شمشیر کی ضربت تو سپر سے
ساعت وہ اجل کی ہے کہ ٹلتی نہیں سر سے

کتنے ہیں مسافر کہ تہِ خاک نہاں ہیں
قبریں تو ہیں ویرانے میں بستی میں مکاں ہیں

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل، جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اس رنج و محن سے
چھٹتا نہیں گھر، جان نکل جاتی ہے تن سے

آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح، عجب شام
کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی، وہ غم و صدمہ و آلام
منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سر انجام

نیند آتی ہے کب، لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

شہادت

لاشے سبھوں کے سبطِ نبیؑ خود اٹھا کے لائے
قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے
فرماتے تھے بچھڑ گئے ہم سب سے ہائے ہائے
اتنے پہاڑ گِر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو
گر سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام
ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبیؑ کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام
برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعدا کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
تھرا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

پوچھو اسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ
اک عمر کا ریاض تھا جس پر لٹا وہ باغ
فرصت نہ اب بکا سے نہ ماتم سے ہے فراغ
جو گھر کی روشنی تھے وہ گل ہو گئے چراغ
پڑتی تھی دھوپ سب کے تنِ پاش پاش پر
چادر بھی اک نہ تھی علی اکبرؓ کی لاش پر

مقتل سے آئے خیمے کے اندر شہِ زمن
پر شدتِ عطش سے نہ تھی طاقتِ سخن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بہ صد محن
اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ اے بہن

پھر ایک بار اس مہِ انور کو دیکھ لیں
اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

بچے سے ملتفت تھے شہِ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بنِ کاہل شریر
مارا جو تین بھال کا اس بے حیا نے تیر
بس دفعتاً نشانہ ہوئی گردنِ صغیر

تڑپا جو شیر خوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہو گیا گودی میں شاہ کی

جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفلِ شیر خوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحالِ زار
بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار
اے خاکِ پاک! حرمت مہماں نگاہ دار

دامن میں رکھ اسے جو محبت علیؑ کی ہے
دولت ہے فاطمہؑ کی امانت نبیؐ کی ہے

خواجہ الطاف حُسین حالی

(۱۸۳۷ تا ۱۹۱۴)

مسلمانوں کا تابناک ماضی

گھٹا اک پہاڑوں سے بطحا کے اٹھی
پڑی چار سو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دور دور اس کی پہنچی
جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

لیے علم و فن ان سے نصرانیوں نے
کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے
ادب ان سے سیکھا صفاہانیوں نے
کہا بڑھ کے لبّیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

ہر اک میکدے سے بھرا جا کے ساغر
ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر
گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبر

کہ حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

ہر اک علم کے فن کے جویا ہوے وہ
ہر اک کام میں سب سے بالا ہوے وہ
فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوے وہ
سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوے وہ

ہر اک ملک میں ان کی پھیلی عمارت
ہر اک قوم نے ان سے سیکھی تجارت

نہیں اس طبَق پر کوئی براعظم
نہ ہوں جس میں ان کی عماراتِ محکم
عرب ، ہند ، مصر ، اندلُس ، شام ، دَیلم
بِناؤں سے ہیں ان کی معمور عالم

سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے ان کا

ہوا اندلُس ان سے گلزار یکسر
جہاں ان کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر
یہ ہے بیتِ حمرا کی گویا زباں پر

کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

سمرقند سے اَندلُس تک سراسر
انھیں کی رصد گاہیں تھیں جلوہ گستر
سوادِ مراغہ میں اور قاسیوں پر
زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجِّم کہاں ہیں

اسلامی مساوات

کسی قوم کا جب الٹتا ہے دفتر
تو ہوتے ہیں مسخ ان میں پہلے تونگر
کمال ان میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر
نہ عقل ان کی ہادی نہ دین ان کا رہبر
نہ دنیا میں عزت نہ ذلت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنت کی پروا
نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا
نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہوا و ہوس میں خودی سے گزرنا
تعیُّش میں جینا، نمائش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بیہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

کہاں بندگانِ ذلیل اور کہاں وہ
بسر کرتے ہیں بے غمِ قُوت و نان وہ
پہنتے نہیں جز سمور و کتان وہ
مکاں رکھتے ہیں رشک خلدِ جنان وہ
نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

یہ ہو سکتے ہیں ان کے ہم جنس کیونکر
نہیں چین جن کو زمانے سے دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر
نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی

یہ پہلا سبق تھا کتابِ ہدیٰ کا
کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالقِ دوسرا کا
خلائق سے ہے جس کو رشتہ وِلا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

اکبر الہ آبادی

(۱۸۴۵ تا ۱۹۲۱)

رباعیات

(۱)

گذرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ
سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم عجم میں جم ہے موجود
کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوہ

(۲)

مجلس میں خیالِ بادہ نوشی پایا
مکتب میں سرِ سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر
لیکن اک عالمِ خموشی پایا

(۳)

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر
لکھیں یا رب مَلِک مرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بیوفائی کی ہے
پایا نہیں میں نے اس کا انجام بخیر

(۴)

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے
دشوار انساں کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی
اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

(۵)

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو
لیکن قرآں کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو
خالق کا کرو خیال ، تکبیر پڑھو

کانفرنس

کانفرنس احباب سے پُر ہے — جو صف ہے وہ سلکِ دُر ہے
سب کو یاد آستاد کا گُر ہے — دلکش ہر اسپیچ کا سر ہے
قومی ترقی کی رادھا پیاری — بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری — چندے کی تحصیل ہے جاری
جمع ہیں ممبر بھولے بھالے — جاڑے کا موسم پھولے پھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے — چندہ دے کر پھنسنے والے
بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں — بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں — کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں
مدعیان رونق دیں ہیں — لیکن باہم بر سر کیں ہیں
واقف فن و ہنر سے نہیں ہیں — کم ہیں ان میں جو آخر بیں ہیں
دوڑاؤ تدبیر کے ریشے — قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے — تا کہ کٹیں افلاس کے بیشے

تم ہو فکرِ جاہ میں الجھے شہرت و شان کی چاہ میں الجھے
نا فہموں کی واہ میں الجھے دل کیوں کر اللہ میں الجھے

خالق کی توحید سکھاؤ عقبٰی کی تمہید سکھاؤ
ملحد کی تردید سکھاؤ روحانی امید سکھاؤ

متفرق اشعار

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

تھی شبِ تاریک، چور آئے، جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

دن کو بھی ان کے ملنے سے بہتر ہے احتراز
ملتے نہیں جو رات کو اپنے مکان پر

نہیں کچھ اس کی پرسش الفتِ اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

شوقِ لیلائے سِول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجیے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجیے

کچھ دیکھتا نہیں میں دلِ زار کے لیے
جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لیے

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیے

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

ان کے گلشن میں دیا کرتا ہے اسپیچ وفا
زاغ ہو جائے گا اک دن آنریری عندلیب

ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

ظفر علی خان

(۱۸۷۳ تا ۱۹۵۶)

نعت

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمھیں تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمھیں تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تار الست سے
اس نورِ اولیں کا اجالا تمھیں تو ہو

سب کچھ تمھارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولٰی تمھیں تو ہو

جلتے ہیں جبرئیل[۴] کے پر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمھیں تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا[۴] تمھیں تو ہو

دنیا میں رحمتِ دو جہاں[۴] اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمھیں تو ہو

علّامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷ تا ۱۹۳۸)

شکوہ

بادہ کش غیر ہیں گلشن میں لبِ جُو بیٹھے
سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کُوکُوُ بیٹھے
دور ہنگامۂ گلزار سے یکَ سو بیٹھے
تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہُوْ بیٹھے!

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

قوم آوارہ عناں تاب ہے پھر سوئے حجاز
لے اڑا بلبلِ بے پر کو مذاقِ پرواز
مضطرب باغ کے ہر غنچے میں ہے بوئے نیاز
تو ذرا چھیڑ تو دے، تشنۂ مضراب ہے ساز

نغمے بیتاب ہیں تاروں سے نکلنے کے لیے
طور مضطر ہے اسی آگ میں جلنے کے لیے

بوے گل لے گئی بیرونِ چمن ، رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنُّم اب تک
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطمُ اب تک

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں
پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں
وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں
ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں
قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی
کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی!

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں
جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں
یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں
پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں
عجمی خُم ہے تو کیا ، مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا ، لَے تو حجازی ہے مری

———

جوابِ شکوہ

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے
کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تو ہے
عصرِ نو رات ہے ، دھندلا سا ستارا تو ہے

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لیے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے ، یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا ، خود داری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے

مثلِ بو قید ہے غنچے میں ، پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ ، تو ذرے سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اِسمِ محمد ؐ سے اجالا کر دے

ہو نہ یہ پھول ، تو بلبل کا ترنُّم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسُّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو ، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

دشت میں ، دامنِ کہسار میں ، میدان میں ہے
بحر میں ، موج کی آغوش میں ، طوفان میں ہے
چین کے شہر ، مراقش کے بیابان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے
چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شانِ رَفَعنَالَکَ ذِکرَکَ دیکھے

مردم چشمِ زمیں ، یعنی وہ کالی دنیا
وہ تمھارے شہدا پالنے والی دنیا
گرمی مہر کی پروردہ ، ہلالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا
تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

عقل ہے تیری سپر ، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش ! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری
کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

———

شاعر

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے
پی کے شرابِ لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مست مئے خرام کا سن تو ذرا پیام تو
زندہ وہی ہے، کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دختر خوش خرام ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جام شراب کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل[4] ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہلِ زمیں کو نسخۂ زندگیِ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

———

طلوعِ اسلام

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں وہ کارواں تو ہے

مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تو، جاوداں تو ہے

حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی[4] ہے معمارِ جہاں تو ہے

تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے

سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

یہی مقصودِ فطرت ہے- یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی

گماں آباد ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی

مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا ؟ زورِ حیدرؓ ، فقرِ بُوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیںؑ پیدا

بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دِلّی نہ بخارا

جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دَو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدّر کا ستارا

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را[1]"

---

۱ - اگر بادشاہ گدا کو نوازیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے -

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء تا ۱۹۸۲ء)

مزار قطب الدّین ایبک

وہ قطب الدین وہ مردِ مجاہد جس کی ہیبت سے
یہ دنیا از سرِ نو جاگ اٹھی تھی خوابِ غفلت سے
وہ جس کی تیغِ ہیبت ناک سے سفاک ڈرتے تھے
وہ جس کے بازوؤں کی دھاک سے افلاک ڈرتے تھے
یہاں لاہور میں سوتا ہے اک گمنام کوچے میں
پڑی ہے یادگار دولت اسلام، کوچے میں
میں اکثر شہر کے پُر شور ہنگاموں سے اکتا کر
سکوں کی جستجو میں بیٹھ جاتا ہوں یہاں آ کر
تخیُّل مجھ کو لے جاتا ہے اک پُر ہول میداں میں
جہاں باہم بپا ہوتی ہے جنگ انبوہِ انساں میں
نظر آتا ہے لہراتا ہوا اسلام کا جھنڈا
بہر سو نور پھیلاتا ہوا اسلام کا جھنڈا!
مقابل میں گھٹائیں دیکھتا ہوں فوجِ باطل کی
نظر آتی ہے فرعونی خدائی اوجِ باطل کی

صدائیں نعرہ ہائے جنگ کی آتی ہیں کانوں میں
بلند آہنگ تکبیریں سما جاتی ہیں کانوں میں

نظر آتا ہے مجھ کو سرخرو ہونا شہیدوں کا
وہ اطمینان ، وہ ہنستا ہوا چہرہ امیدوں کا

عَلَم کے سائے میں سلطانِ غازی کا بڑھے جانا
سر دشمن پہ افواجِ حجازی کا چڑھے جانا

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غازی مرد ہوں میں بھی
پرانے لشکرِ اسلام کا اک فرد ہوں میں بھی

شہادت کے رجز پڑھتا ہوں میدان شہادت میں
رجز پڑھتا ہوا بڑھتا ہوں ارمانِ شہادت میں

عظیم الشان ہوتا ہے یہ منظر پاکبازی کا
شہیدوں کی خموشی ، غلغلہ مردانِ غازی کا

مرا جی چاہتا ہے اب نہ اپنے آپ میں آؤں
اسی آزاد دنیا کی فضا میں جذب ہو جاؤں

(اقتباس از شاہنامۂ اسلام)

جلوۂ سحر

(۱)

چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر
زمیں پہ نور چھا گیا فلک پہ رنگ آ گیا
تمام زادگانِ شب چمک چمک کے سوگئے
شرار آسمانِ شب دمک دمک کے سوگئے
ستارے زرد ہو چکے چراغ سرد ہو چکے
وہ ٹمٹما کے رہ گئے یہ جھلملا کے رہ گئے
چلا ستارۂ سحر سنا کے صبح کی خبر

(۲)

یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے سیہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے طلسم شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی یکایک ایک روشنی
نگاہ جاں میں آ گئی حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا غبار شرق سے اٹھا

(۳)

عبادتوں کے در کھلے سعادتوں کے گھر کھلے
درِ قبول وا ہوا دعا کا وقت آ گیا
اذان کی صدا اٹھی جگا دیا نماز کو
چلی ہے اٹھ کے بندگی لیے ہوئے نیاز کو

صنم کدہ بھی کھل گیا اٹھا ہے شور سنکھ کا
چلو نمازیو چلو اٹھو پجاریو اٹھو
عبادتوں کے در کھلے سعادتوں کے گھر کھلے

(۴)

کسان اٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں کو لے چلے
کبھی مزے میں آ گئے تو کوئی تان اڑا گئے
یہ مرد شبنمی ہوا یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش سبز گھاس کا یہ دل فریب آسماں
بسے ہوئے ہیں پریت میں ہیں محو ان کے گیت میں
کہاں ہیں شہر کے مکیں وہ بے نصیب اٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں کو لے چلے

(۵)

اٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباس نور زیبِ بر چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے پہاڑ طور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے سحابِ نور بن گئے
نوائے جوئبار اٹھی صدائے آبشار اٹھی
ہواؤں کے رباب اٹھے خوش آمدید کے لیے
اٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاجِ زر

———

فیض احمد فیض

(۱۹۱۰ تا ۱۹۸۴)

تنہائی

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا ، کہیں اور چلا جائے گا

ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ

سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ

گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

مجید امجد

(۱۹۱۴ تا ۱۹۷۴)

طُلُوعِ فرض

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں

کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں
امیدوں کے سنہرے جال بن کے چلا جاتا ہے چگنے دانے دنکے
فضائے زندگی کی آندھیوں سے
مجھے چل کر اسے اڑ کر گذرنا ہے ہر اک کو بچشم تر گذرنا

وہ اک اندھی بھکارن لڑکھڑائی
کہ چورا ہے کے کھمبے کو پکڑلے صدا سے راہگیروں کو جکڑلے
یہ پھیلا پھیلا میلا میلا دامن
مرا دفتر، مری مسلیں، مری میز یہ کاسہ یہ گلوے شور انگیز

چمکتی کار فرّاٹے سے گذری
غبار رہ نے کروٹ بدلی، جاگا   اٹھا اک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیا پے ٹھوکروں کا یہ تسلسل
یہی پرواز بھی افتادگی بھی   متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس شرابوں سا نشیلا   کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا اک رینگتے کیڑے کو پینا   مگر مقصد وہی دو سانس جینا

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی۔ سرِ کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے، دونوں سمت،گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار اک تیز موڑ، اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند
تھام کر جس کو گذر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں

آہ آن گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

احسان دانش

(۱۹۱۴ تا ۱۹۸۲)

قطعات

(۱)

پھر سنی کے کھیت پکے ، ڈالیاں بجنے لگیں
چھڑ گئے گنوں کے کھیتوں میں ہواؤں سے ستار
ہائے کیا دن تھے کہ تھا وحشت کو سامانِ سرور
شام پڑتے نہر کے پل پر کسی کا انتظار

(۲)

لے گئے وہ ساتھ ساری زندگی کی رونقیں
گھر کا یہ عالم ہے ان کے روٹھ کر جانے کے بعد
جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوتِ مضمحل گاڑی گذر جانے کے بعد

(۳)

پھاوڑا کندھے پہ رکھے آ رہا ہے اک کسان
رنگ جس کے خون سے لیتے ہیں گلزاروں کے پھول
دل میں جینے کی تمنائیں فضا ناسازگار
آنکھ میں سرخی، لبوں پر پپڑیاں، نتھنوں میں دھول

(۲)

لاکھ ناداری ہو میں ہوں شاعرِ وحدت پرست
نقش جو بھی سامنے آیا وہی رد ہو گیا
جب سوا اس کے کسی کا دل میں گذرے گا خیال
میں تو اے دانش یہ سمجھوں گا کہ مرتد ہو گیا

———

نذیر احمد شیخ

(۱۹۱۱ تا ۱۹۷۲)

منافع خوری

جہاں تک ان دکانوں پر نظر دوڑائی جاتی ہے
ضرورت کی ہر اک شے ان میں غائب پائی جاتی ہے

دساور سے یہاں تک جنس کو آتے تو دیکھا ہے
مگر آگے خدا جانے کہاں دفنائی جاتی ہے

دوا آبِ بقا ہے چشمۂ ظلمات میں پنہاں
جنابِ خضر آئیں تو بہم پہنچائی جاتی ہے

دکان داروں کے گھر پر اب صدائیں دینی پڑتی ہیں
ہزاروں مرتبہ زنجیرِ در کھڑکائی جاتی ہے

بڑی مشکل سے پہلے جنس گاہک کو دکھاتے ہیں
بتا کر نرخ بالا پھر قیامت ڈھائی جاتی ہے

اُدھر لالچ کے پلڑے میں نکمّا مال تلتا ہے
ادھر گاہک کے رخ پر مردنی سی چھائی جاتی ہے

منافع خور راہِ نیک و بد کب دیکھ سکتا ہے
ملے دولت تو عقل و ہوش کی بینائی جاتی ہے

اسی بازار کی اک اور بھی تصویر ملتی ہے
جہاں ہر جنس کی خالی شباہت پائی جاتی ہے
یہ مرچیں ہیں جنہیں گیرو نے اپنا رنگ بخشا ہے
یہ ہلدی زرد مٹی ہے فقط پسوائی جاتی ہے
کہیں چاول کی کنکی پر چڑھا ہے قند کا شیرہ
یہ چینی ہے جو دنیا کے گلے چپکائی جاتی ہے
نہ چکنائی نہ بالائی یہ خالص دودھ ہے بھائی !
کہ جس کو دیکھ کر اب بھینس بھی شرمائی جاتی ہے
برادے سے کرے ہے نانبائی استفادہ جب
تو کتوں پر نظر قصاب کی للچائی جاتی ہے
کہیں آلو میں چربی کو رگڑ کر گھی بناتے ہیں
عجب حکمت سے رُوحِ کیمیا تڑپائی جاتی ہے
خس و خاشاک کی عطّار پڑیا باندھ دیتا ہے
سڑک کی خاک بھی جس میں عطا فرمائی جاتی ہے
بھنے تیتر سرِ بازار بکتے ہوں تو یہ سمجھو
پس پردہ کہیں کووں کی شامت لائی جاتی ہے
غذا میں مل رہا ہے بے محابا تیل مٹی کا
ہماری خشک آنتوں میں یہی چکنائی جاتی ہے
مشینوں کو یہی رُوحِ رواں حرکت میں لاتی ہے
بشر پی لے تو آخر کیا قیامت آئی جاتی ہے
اسی سے حضرتِ حجام ریزر تیز کرتے ہیں
اسی سے گاہکوں کی کھوپڑی سہلائی جاتی ہے
اطبّا کا یہ کہنا ہے کہ ایسا تیل پینے سے
توانائی تو آتی ہے مگر دانائی جاتی ہے

سید محمد جعفری

(۱۹۱۱ء تا ۱۹۷۶ء)

ایبسٹریکٹ آرٹ

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی از راہ مروت بھی ستائش میں نے

آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں

ایک تصویر کو دیکھا جو کمال فن تھی
بھینس کے جسم پہ اک اونٹ کی سی گردن تھی

ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں
ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں

نقش محبوب مصور نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا

ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورق صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے

آڑی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوے آئینے پہ سورج کی کرن

ایبسٹریکٹ آرٹ کے ملبے سے یہ دولت نکلی
جس کو سمجھا تھا انناس وہ عورت نکلی

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

کیسی تصویر بنائی مرے بہلانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

———

مرزا محمود سرحدی

(۱۹۱۳ تا ۱۹۶۸ء)

قطعات

۱

بے خبر اب تو ہے دولت ہی شرافت کا نشاں
لوگ پہلے کبھی تحویلِ نسب کرتے تھے
اب تو شاگردوں کا استاد ادب کرتے ہیں
سنتے ہیں ہم — کبھی شاگرد ادب کرتے تھے

۲

تمام زر کے کرشمے ہیں آج دنیا میں
شریف کوئی نہیں ہے رذیل کوئی نہیں
جو اپنی آپ کفالت نہ کر سکے **محمود**
تو جان لیجیے اس کا کفیل کوئی نہیں

۳

نوکری کے لیے اخبار کے اعلان نہ پڑھ
جان پہچان کی باتیں ہیں، کہا مان، نہ پڑھ
جن کو ملنی ہو انھیں پہلے ہی مل جاتی ہے
بس دکھاوے ہی کے ہوتے ہیں یہ فرمان نہ پڑھ

۴

قائم کچھ ایسے لوگوں کا دنیا میں ہے وقار
دنیا کچھ ایسے لوگوں پہ کرتی ہے اعتبار
چوروں کو جو دکھائیں مقام نقب زنی
اور مالکِ مکان سے کہہ دیں کہ ہوشیار

۵

جس کا بس چلتا نہیں بیوی پہ گھر میں آج کل
باہر آ کر کوستا ہے پہلے پاکستان کو
اس قدر ہو جائے جس کی پست ذہنیت تو پھر
فوقیت حاصل ہے اس انسان پر حیوان کو

غزلیات

خواجہ میر درد

(۱۷۱۹ تا ۱۷۸۵)

۱

باغِ جہاں کے گل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں

وابستہ ہے ہمیں سے گر جبر ہے وگر قدر
مجبور ہیں تو ہم ہیں مختار ہیں تو ہم ہیں

الفاظِ خلق ہم بن سب مہملات سے تھے
معنی کی طرح ربطِ گفتار ہیں تو ہم ہیں

تیرا ہی حسن جگ میں ہر چند موج زن ہے
تسپر بھی تشنہ کامِ دیدار ہیں تو ہم ہیں

اوروں سے تو گرانی یک لخت اٹھ گئی ہے
اے درد اپنے دل کے گر بار ہیں تو ہم ہیں

۲

نہ ہاتھ اٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے
کسے دماغ کہ ہو دُو بدو کمینے سے

ترقی اور تنزّل کو یاں کے کچھ عرصہ
مثال ماہ زیادہ نہیں مہینے سے

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تُو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مآلِ کار سجھایا قبور نے ہم کو
یہ نقد مال لگا ہاتھ اس دفینے سے

بسا ہے کون ترے دل میں گل بدن اے درد
کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

۳

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں
جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں

موت کیا آکے فقیروں سے تجھے لینا ہے
مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

ہم کسی راہ سے واقف نہیں جوں نُورِ نظر
رہنما تُو ہی تو ہوتا ہے جدھر جاتے ہیں

آہ ! معلوم نہیں ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالَم سے
درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

میر محمد تقی میر

(۱۷۲۳ تا ۱۸۱۰ء)

۱

غافل ہیں ایسے سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

فردوس کو بھی آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوے بتاں کے لوگ

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت ولے
کم آشنا ہیں طور سے اس کامِ جاں کے لوگ

مجنوں و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

کیا سہل جی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

بت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

منہ تکتے ہی رہیں ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ میر محو ہیں میری زباں کے لوگ

۲

جنوں میں اب کی کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے، پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالم تصویر بھی آخر

نہ دیکھی ایک واشد اپنے دل کی اس گُلستاں میں
کھلے پائے ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر

سرو کار آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھیے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو
کبھی آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر

کلیجہ چھن گیا، پر جان سختی کش بدن میں ہے
ہوئے اس شوخ کے ترکش کے سارے تیر بھی آخر

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہو گا اس چلن سے **میر** بھی آخر

۳

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لُٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخمِ جگر داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیداد گری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

۲

تھا شوق مجھے طالبِ دیدار ہوا میں
سو آئینہ سا صورتِ دیوار ہوا میں

جب دُور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں

کیا چیتنے کا فائدہ جو شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

اب پست و بلند ایک ہے جوں نقشِ قدم یاں
پامال ہوا خوب تو ہموار ہوا میں

بازار وفا میں سرِ سودا تھا سبھوں کو
پر بیچ کے جی ایک خریدار ہوا میں

ہشیار تھے سب دام میں آئے نہ ہم آواز
تھی رفتگی سی مجھ کو گرفتار ہوا میں

رہتا ہوں سدا مرنے کے نزدیک ہی اب میر
اس جان کے دشمن سے بھلا یار ہوا میں

خواجہ حیدر علی آتش

(۱۷۶۴ تا ۱۸۴۶)

(۱)

صلے پہونچے ہیں ہمارے بازوؤں پر سیکڑوں
گم ہوئے ہیں اپنے یوسف سے برادر سیکڑوں

یہ سعادت لکھی ہے قسمت میں کس کی دیکھیے
خوں گرفتہ ایک میں ہوں اور خنجر سیکڑوں

فقر کے کوچے میں قدرِ دولت دنیا نہیں
ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے پتھر سیکڑوں

روندتا ہوں سبزۂ رہ کی طرح وُہ بُوٹیاں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن کو کیمیا گر سیکڑوں

چشم معنی آشنا میں ہے مقام ان کا وہی
سہو کاتب سے مقدّم ہوں مؤخر سیکڑوں

جلوہ گر ہے حسن ہر جا عاشقوں کے واسطے
خوبصورت رکھتے ہیں یہ ہفت کشور سیکڑوں

دل دیا چاہے تو آتش دلربا موجود ہیں
خوب تر سے خوب تر بہتر سے بہتر سیکڑوں

(۲)

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی ، بہار راہ میں ہے

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل،نہ،ٹھہر آتش
گلِ مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

(۳)

جگر کو داغ میں مانند لالہ کیا کرتا
لبالب اپنے لہو کا پیالہ کیا کرتا

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

نہ کرتی عقل اگر ہفت آسمان کی سیر
کوئی یہ سات ورق کا رسالہ کیا کرتا

کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا
کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

جریدہ میں رہ پُر خونِ عشق سے گذرا
جرس سے قافلے میں بحثِ نالہ کیا کرتا

مہِ دو ہفتہ بھی ہوتا تو لطف تھا آتش
اکیلے پی کے شراب دو سالہ کیا کرتا

(۲)

یہ آرزو تھی تجھے گل کے رو برو کرتے
ہم اور بُلبلِ بیتاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
زبان غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

جو دیکھتے تیری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

———

محمد ابراہیم ذوق

(۱۷۸۹ء تا ۱۸۵۴ء)

(۱)

موت ہی سے اب علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسل میت ہی ہمارا غسلِ صحّت ہو تو ہو

ہو، تو ہو آباد کیونکر یہ خراب آباد دل
عشق غارت گر اگر دنیا سے رخصت ہو، تو ہو

دست ہمت سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

اب زباں پر بھی نہیں آتا کبھی الفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ اس سے کتابت ہو تو ہو

آگ میں جل مرتا ہے پروانے سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو؟ لیکن محبت ہو تو ہو

تلخ کامی ہی میں گزری زندگانی عمر بھر
جانِ شیریں کے دیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

رات اک پگڑی ہوئی تھی میکدے میں رہنِ مے
ذوق یہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

(۲)

ہفتاد و دو فریق ، حسد کے عدد[1] سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں
خورشید وار ، دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ
روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں
جاں دادگانِ عشق سے پوچھو فنا کی راہ
اس میں جنابِ خضر[۴] ابھی نابلد سے ہیں
جا ان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں
دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مُہرِ داغِ عشق
ہم کرتے ذوق عشق کا دعوٰی سند سے ہیں

(۳)

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے ،
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے
کم ہونگے اس بساط میں ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بری چلے
ہو عمر خضر بھی تو کہیں گے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے
بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے
دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے
جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوق
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

---

۱ - حروف ابجد کے حساب سے لفظ : ''حسد'' کے بہتر عدد بنتے ہیں
(ح = ۸ ، س = ۶۰ ، د = ۴)

میرزا اسد اللہ خان غالب

(۱۷۹۷ء تا ۱۸۶۹ء)

(۱)

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں ہر درد کی دوا
یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عُمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خُو کے در سے ۔اب اُٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

(۲)

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

لوگوں کو ہے خُورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اُٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخن ور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

(۳)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہو گا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تجھ سے
وگرنہ خوف بد آموزی عدو کیا ہے

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

الطاف حُسین حالی

(۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۴ء)

(۱)

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

جانتے ہیں آپ کو پرہیز گار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

گر کسی کا عیب سن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رسوا اسے دل کھول کر

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احسان اگر

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سوئے شر

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب ان کا ظاہر اور اپنا ہنر

دوست اک عالَم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حذر یارو حذر

(۲)

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

قافلے گذریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص

قیس سا پھر نہ اٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ایک ہی شخص

جھمگٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ سہی ، شیخ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی پہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص

(۳)

اس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت

کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبل
کل نہ پہچان سکے گی گلِ تر کی صُورت

دیکھیے شیخ مصور سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو ! آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت

میں بچا تیر حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم، سپر کی صورت

حملہ اپنے پہ بھی اک، بعد ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے، بہت آج بھنور کی صورت

ان کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

———

حسرت موہانی

(۱۸۷۵ء تا ۱۹۵۱ء)

(۱)

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حبِ وطن مستِ خواب دیکھیے کب تک رہے

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم و حجاب دیکھیے کب تک رہے

تابہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھیے کب تک رہے

پردۂ اصلاح میں کوشش تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھیے کب تک رہے

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیر نقاب دیکھیے کب تک رہے

دولت ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزمِ حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھیے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر جور غلامانِ وقت
از رہ بغض وعتاب دیکھیے کب تک رہے

(۲)

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیِ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

ترے ستم سے میں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

ترے کرم کا سزا وار تو نہیں حسرت
اب آگے تری خوشی ہے جو سرفراز کرے

(۳)

تاثیر برقِ حسن جو ان کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

اک رنگ التفات بھی اس بے رخی میں تھا
اک سادگی بھی اس نگہٗ سحر فن میں تھی

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل
کیفیّتِ بہار کی شدت چمن میں تھی

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے ہٹ گئی
ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

———

علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷ تا ۱۹۳۸)

(۱)

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

یہ مدرسہ یہ جواں یہ سرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

فقیہہ شہر کی تحقیر کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

کیے ہیں فاش رمُوزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

(۲)

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق
علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق
اسی طلسمِ کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اس کی ہیں اب تک بتانِ عہدِ عتیق
مرے لیے تو ہے اقرار باللساں بھی بہت
ہزار شکر کہ ملا ہیں صاحبِ تصدیق
اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

(۳)

دل بیدار فاروقی رض دل بیدار کراری [۴]
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری
دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوے تاتاری
خداوندا ! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری
مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری
تو اے مولاے یثرب [۳] آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زناری

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ تا ۱۹۸۲)

(۱)

جس کو مجھ میں بھی کوئی بات نظر آتی ہے
اے خدا ایک تری ذات نظر آتی ہے

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

یہ عجب مرحلۂ عمر ہے یا رب کہ مجھے
ہر بری بات بری بات نظر آتی ہے

چلتے پھرتے ہوئے مردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش و خروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے

زندگی میں تو کوئی چیز انوکھی نہ رہی
موت ہی اب تو نئی بات نظر آتی ہے

تیرے اترے ہوئے چہرے پہ بھی یاروں کو حفیظ
سرخیٔ حرف و حکایات نظر آتی ہے

(۲)

او دل توڑ کے جانے والے دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

ہاں میرے مجروح تبسّم خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہست و بود یہی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

یہ دکھ درد کی برکھا، بندے، دین ہے تیرے داتا کی
شکر نعمت بھی کرتا جا دامن بھی پھیلاتا جا

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا سامان کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات بتاتا جا

دونوں سنگِ راہ طلب ہیں راہنما بھی منزل بھی
ذوق طلب! ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چننے والے چن لیں گے
سننے والے سن لیں گے تو اپنی دھن میں گاتا جا

———

ناصر کاظمی

(۱۹۲۵ تا ۱۹۷۲)

(۱)

کارواں سست راہبر خاموش
کیسے گذرے گا یہ سفر خاموش

تجھے کہنا ہے کچھ مگر خاموش
دیکھ اور دیکھ کر گزر خاموش

یوں ترے راستے میں بیٹھا ہوں
جیسے اک شمع رہگزر خاموش

اٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش

شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش

ابھی وہ قافلے نہیں آئے
ابھی بیٹھیں نہ ہمسفر خاموش

(۲)

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوے
وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوے
میں ان کی راہ دیکھتا ہوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہوے
یہ کون لوگ ہیں مرے ادھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوے
عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوے
یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اٹھانے والے کیا ہوے

(۳)

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

سو گئے لوگ اُس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

———

مشکل الفاظ

(سطور ذیل میں بعض ایسے الفاظ کی شرح دی جا رہی ہے جو
عام طور پر لغتوں میں نہیں ملتے اور اصطلاحی معنی رکھتے ہیں)

ماما عظمت

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
۱	اچاپت	قرض ، لین دین
۲	کڑاہی	پکوان : پوریاں ، پکوڑے وغیرہ
۱۲	پھٹکل حساب	چھوٹا ، متفرق حساب
۱۳	آنکنا	اندازہ لگانا - اندازے سے دام لگانا -
۱۶	رہنے کا ٹھیکرا	مکان مراد ہے -
۱۷	کوتک	کرتوت - بری عادتیں -

فراموش

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
۴۶	فراموش یا مراموش بدنا	ایک کھیل کا نام جس میں شرط یہ بدی جاتی ہے کہ اگر ہم تم کو چیز دھوکے سے دے کر کہ دیں کہ "فراموش" تو تم کو وہ چیز شرط میں مقرر کردہ تعداد کے مطابق دینی ہوگی - اس کھیل میں عموماً دوگاڑا پھل یا سبزی وغیرہ دی جاتی ہے - یہ پھل یا سبزی سرپوش یا رومال سے ڈھانپ کر دی جاتی ہے -

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
		اگر لینے والا شخص وہ چیز لینے سے پہلے ہی کہ دے کہ "یاد ہے" تو اسے کچھ نہیں دینا پڑتا ۔

آغا حشر

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
۱۴۸	سہیلیاں	تھیٹر کے زنانہ کردار (جو اس زمانے میں اکثر لڑکے ہوتے تھے) پردہ اٹھتے ہی یہ تمام کردار ایک قطار میں کھڑے کورس گاتے نظر آتے تھے جو "حمد" یا "بھجن" ہوتا تھا ۔

خوابوں کا جزیرہ

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
۱۷۶	شکر بھجی	شکر بھیگی کہ نہیں ؟ بچوں کے ایک کھیل کا نام ہے جس کے پنجاب کے مختلف علاقوں میں مختلف نام ہیں ۔ اشفاق احمد کے علاقہ میں اسے شکر بھجی کہتے تھے ۔

مسلمانوں کا تابناک ماضی

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
۲۲۵	ٹیگس	پرتگال اور سپین کے ایک دریا کا نام ۔ جس کے کنارے لزبن واقع ہے ۔
۲۲۵	روحانی	وہ لوگ جو مذہب کو صرف روحانی باتوں تک محدود سمجھتے ہیں ۔
۲۲۵	یزدانی	پارسی جو خیر اور شر کے دو الگ الگ خالقوں کو مانتے ہیں ۔ (یزداں خالق خیر اور اہرمن خالق شر) ۔

صفحہ نمبر	الفاظ	معانی و مفہوم
۲۲۶	فلاحت	زراعت - زراعت میں مہارت -
۲۲۶	کوہ آدم	لنکا کے سلسلۂ کوہ کی سب سے اونچی چوٹی -
۲۲۶	کوہ بیضا	اندلس کا ایک پہاڑ اس کی چوٹی کیونکہ تقریباً تمام سال برف سے ڈھکی رہتی ہے اس لیے عرب اس کو قلعۂ بیضا یا کوہ بیضا کہتے تھے -
۲۲۶	بیت حمرا	الحمرا سرخ پتھر کی یہ عمارت جسے عبدالرحمٰن دوم نے تعمیر کرایا تھا دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتی ہے -
۲۲۷	مراغہ	آذر بائیجان میں مروان بن محمد کا آباد کیا ہوا شہر - ہلاکو خاں نے اس شہر کے باہر محقق طوسی کی نگرانی میں ایک رصدگاہ بنوائی تھی -
۲۲۷	قاسیون	دمشق کے شمال میں ایک پہاڑ ہے جہاں ایک روایت کے مطابق ہابیل کو قابیل نے قتل کیا تھا - مامون الرشید نے یہاں رصد گاہیں تعمیر کرائی تھیں -

تیار کردہ: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور۔
منظور کردہ قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان۔

تمباکو نوشی صحت کے لیے مضر ہے

سیریل نمبر
49076

ایڈیشن	طباعت	تاریخ اشاعت	تعداد اشاعت	قیمت
دوم	14	جولائی 1992	15,000 + 43,000 = 58,000	14.15